رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جو بنام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا گیا۔ اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں اور ابتداء میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے، جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی و وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے، جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کیے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان سے، تقطیع خورد دعہ، حصہ سوم تقطیع کلان سے للعہ، تقطیع خورد معہ، حصہ چہارم تقطیع کلان ہے روپیہ، تقطیع خورد معہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ للعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۱ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۸ء | عدد ۲

مضامین

شذرات

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی صاحب ترجمان القرآن حیدرآباد دکن کے سنجیدہ مذہبی مضامین نوجوانون کے خیالات کے درست کرنے کے لئے بیحد مفید ہوتے ہین، اب حیدرآباد دکن سے پنجاب (جمالپور متصل پٹھان کوٹ) چلے آئے ہیں، امید ہو کہ زندہ دلون کے ملک مین پہنچکر وہ اس کی نئی زندگی کا باعث اور اس کے بڑھتے ہوے مذہبی انتشار کے لئے تسکین کا موجب ہونگے، رسالہ بھی یہین سے نکلیگا،

اب یہ رسالہ صرف ایک رسالہ نہ ہوگا، بلکہ دارالاسلام نام ایک مذہبی مرکز کا نقیب بھی ہوگا، اس مرکز کے لئے ایک نیک دل مسلمان نے بہت بڑی زمین وقف کردی ہی، مسجد، اقامت گاہ اور بعض ضروری مکانات بھی اس مین تعمیر کردیے ہین، اور اسکو ان لوگون کے لئے جنکو مذہبی تحقیقات کا شوق، اور خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کی آرزو ہی، خاص کردیا گیا ہے، دعا ہے کہ یہ دارالاسلام اپنے حقیقی معنون مین مسلمانون کے لئے دارالاسلام ثابت ہو،

رسالہ کے لائق مدیر کئی نمبرون سے مذہب اور سیاسیات پر زور قلم صرف کررہے ہین، اس سلسلہ مین انھون نے میری ایک آدھ ناتمام تقریر اخبارون میں پڑھکر اس کی تردید مین ان موشگافیون اور نازک استنباطون سے کام لیا ہے، جو کہنے والے کے حاشیۂ خیال مین بھی نہین، اس دور مین جب کہ پروپگنڈا ایک فن کی حیثیت اختیار کرچکا ہی اس قسم کی باتین خلافِ توقع نہین لیکن مدیر ترجمان القرآن کو مین اس بلاے عام سے بالاتر سمجھتا ہون، اس لئے مین ان کی تسکین کے لئے یہ ظاہر کردینا چاہتا ہون کہ اگر وہ میرے گذشتہ بیس برس کی تحریرون اور تجویزون سے واقف ہوتے تو ان پر ظاہر ہوچکا ہوتا کہ "سلطنت در سلطنت" کی اصطلاح گو نئی ہو مگر خیال نیا نہین ہے، مجھے ان کے مقاصد اور اصل مقصد سے پورا اتفاق ہی، اختلاف ہو تو ان کی تحریر کے نتائج اور طریق کار سے،

اس سلسلہ مین انھون نے میری مرعوبیت کے ثبوت مین ایک ہندو صاحب قلم کے خط سے جس کو اس نے گاندھی جی کے نام بھیجا تھا، اور جس کو مین نے اس سے پہلے نہین پڑھا تھا، یہ اقتباس نقل کیا ہو کہ مین نے یوم سیرت کی ایک مطبوعہ تقریر مین انحضرت صلعم کو "سوامی محمد" لکھا ہی، مدیر ترجمان ماشاء اللہ روایت کے ساتھ درایت کے بھی ماہر ہین، وہ میری طرز تحریر سے واقف ہین وہ سننے کے ساتھ فیصلہ کرسکتے تھے کہ سبحانک ھذا بھتانٌ عظیم، یہ میری مطبوعہ تقریر سیرت جس کا نام رسولِ وحدت ہی ناپید بھی نہین کہ وہ واقعہ کی تحقیق نہین کرسکتے تھے، اور مجھو دشمنون کی غلط فہمی سے محفوظ نہین رکھ سکتے تھے، بہرحال حکایت بالا سراسر خلافِ واقعہ ہے، رسالہ موجود ہے ہر شخص دیکھ سکتا ہی، البتہ اس رسالہ کا ترجمہ بہت سی زبانون مین ہوا ہے، ممکن ہو کہ کسی ہندی ترجمہ مین ایسا ہوا ہو، سو مجھے اس کی خبر نہین اور نہ مجھ پر اس کی ذمہ داری ہی،

کئی مہینے ہوے کہ ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو عالم مولوی حافظ **محمد عمران خان** ندوی منصرم دارالعلوم اور مولوی **سعد الدین** صاحب ندوی مدرس دینیات جامعہ ملیہ دہلی، اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے مصر گئے ہین، اور جامع ازہر مین داخل ہوے ہین، ازہر مین اس سے پہلے بھی ندوہ کے طالب العلم گئے ہین، مگر ان دونون صاحبون کا کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے اپنی جرأت اور خودداری اور جامع ازہر کے ہندی وفد کے ارکان اور سکریٹری کی سفارش سے دارالعلوم ندوہ کی سندِ فضیلت کو کالج کی سند منواکر، وہان تخصص (ڈاکٹریٹ) کے درجہ مین داخلہ کی اجازت حاصل کی ہی، اور یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی بیرونی درسگاہ کو حاصل نہین ہوا،

ہمارے خیال مین جامعہ ازہر کی ریاست کے لئے یہ موزون ہوگا کہ وہ اپنے ارکان وفد کے مشورہ سے

ہندوستان کی مشہور عربی درسگاہوں کی سندوں کو معیار مان کر ان کے مطابق وہاں کے فارغ طلبہ کو اپنے یہاں داخلہ کی اجازت دیدے، ابھی دیوبند کے ایک فارغ عالم حیدرآباد دکن سے جا رہے ہیں، امید ہے کہ ان کے داخلہ کے وقت کوئی قاعدہ عام بن سکے،

اردو ان صوبوں میں بھی جہاں وہ مادری زبان نہیں، ایک عام ملکی ہندوستانی زبان کی حیثیت سے آگے کو بڑھ رہی ہے، دسمبر کے آخر اور جنوری کے شروع میں سندھ کے دارالسلطنۃ کراچی میں ایک کامیاب اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سندھ کے اندر اس زبان کی اشاعت کے مسئلہ پر غور کیا گیا، اس وقت سندھ میں سات اردو ہفتہ وار اخبار نکل اور پچاس اردو اسکول چل رہے ہیں،

وہاں اردو اخباروں میں الحبیب اخبار دو سال سے کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، ہم کو ان صوبوں میں ہندوستانی زبان کے اخباروں کی ضرورت صرف ادبی ہی نقطۂ نظر سے نہیں ہے، بلکہ اس لئے بھی ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہندوستان کی مسلمان قوم ملک کے موجودہ رجحان دستور کے مطابق صوبوں میں بٹ کر اپنی مشترکہ ملکی اہمیت کھو بیٹھیگی اس لئے ضرورت ہے کہ سندھ، بمبئی، مدراس، متوسط اور سرحد میں اس زبان کے اخباروں کی پوری پوری مدد کیجائے اور ان کی ہمت بڑھائی جائے،

احاطہ مدراس میں بنگلور گویا ایک بین الاقوامی شہر ہے، اور اسی سے وہاں ہندوستانی زبان کو کافی فروغ ہے، وہاں ایک مسلم اردو لائبریری پچیس برس سے قائم ہے، اس لائبریری کا اتنی عمر پا جانا اسکی قوت حیات کی دلیل ہے، اب ارکان کوشش کر رہے ہیں کہ اسکی اپنی عمارت ہو جائے، اہلِ مدراس و میسور کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں، شرط ہمت اور عزیمت ہے، امید ہے کہ مدراس و میسور کے مسلمان ادھر توجہ کرینگے،

مقالات

جواہر تفسیر

مقدمۂ تفسیر جواہر

ایک کے مافی الضمیر کی تشریح دوسرے کی زبان سے کتنا مشکل کام ہے، پھر جب کسی انسانی قول کی تشریح میں اتنا اشکال ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کی تشریح اس کے بندوں کی زبان وقلم سے جتنا مشکل ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کسی نے خوب کہا ہے کہ قرآن پاک کی کوئی تفسیر کبھی مکمل نہیں ہوسکتی، کیونکہ شارح کے لئے ضروری ہے، کہ وہ ماتن سے زیادہ علم رکھتا ہو، ورنہ کم سے کم اس کے برابر تو ہو، اور اس کا تصور بھی کسی بندہ میں قرآن اور صاحبِ قرآن کی نسبت سے نہیں کیا جاسکتا،

شارح اور مفسر کا کام یہ ہے کہ ماتن کے اختصار کی تفصیل اور اجمال کی توضیح کرے، اسکے کلام بے دلیل کی دلیل دے، اسکی بات پر کوئی شبہہ یا اعتراض پیدا ہو تو اسکو دور کرے، اسکے لفظوں کی گرہ کھولے، اس کے مضمون کی پیچیدگی کو صاف، اور مطلب کی دشواریوں کو حل کرے، قولوں میں کہیں تضاد نظر آئے تو ان میں تطبیق دے، اور اسکے ایک قول سے دوسرے قول کو سمجھنے کی کوشش کرے،

یہ اور اسی قسم کے اور طریقے ہیں، جن سے انسانوں کے کلام کو سمجھتے، اور ان کی دشواریوں کو حل کرتے ہیں، لیکن قرآن پاک کی تفسیر میں ان طریقوں کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی ہیں، جو قرآن ہی کیساتھ مخصوص ہیں، قرآن خدا کا کلام ہے، جو ۲۳ برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کرکے ملک عرب میں، فصیح وبلیغ عربی زبان

میں خدا کے ایک برگزیدہ بندہ پر اترا، اس میں نظریے بھی تھے، اور عملی تعلیمات بھی، اس نے اُن نظریوں کو
کے بندوں کو سمجھایا، اور ان عملی تعلیمات کو عملاً ترکے اور برت کے اپنے آس پاس والوں کو دکھایا، اور بتایا
اسلئے کہ وہ اس کلام کا پہلا مخاطب تھا، اور اسی کے ذریعہ اس کلام کا مطلب دوسروں کو سمجھانا تھا، اس لئے
پڑے گا، کہ وہی اس کلام کے مطلب کو سب سے بہتر سمجھ سکتا تھا، اور اسی لئے وہ اس کلام کا جو مطلب سمجھا، اور اپنے
اور عمل سے اس نے دوسروں کو جو سمجھایا، وہی اس کا صحیح اور بے خطا مطلب اور مفہوم ہے، اس لئے قرآن پاک کے
سمجھنے کے لئے حامل قرآن محمد رسول اللہ صلعم کی قولی و عملی تفسیر سے بہتر قرآن کی تفسیر کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا
کی قولی و عملی تفسیر سنت ہے، اور قرآن کتاب، سنت اور کتاب اسلام کے وہ بنیادی پتھر ہیں، جن پر اسلام کی
عمارت کھڑی ہے،

حامل قرآن علیہ السلام کے بعد قرآن کی فہم میں ان سے تربیت اور فیض پائے ہوئے اشخاص کا مرتبہ
جنھوں نے رسول اللہ صلعم کی زبان وحی ترجمان سے ان آیتوں کو سنا، آیتوں کے ماحول کو جانا، اور جو اس فضا
سے آشنا تھے، جو آیتوں کے نزول کے وقت موطن وحی میں جلوہ گر تھی، اس کے بعد تابعین کا گروہ ہے جنھوں
نے صحابہ سے اس فیض کو حاصل کیا، اور خاص طور سے قرآن پاک کی تعلیم اور تعلم کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایا
دن رات وہ اس کے ایک ایک لفظ کی تحقیق، اور اس کے لغوی و صرفی و نحوی ترکیبوں کا حل، اور کلام عرب سے
ہر قرآنی محاورہ کی تطبیق کرتے تھے،

آجکل بعض عقلیت پسندوں کا میلان ادھر ہے، کہ وہ اس طریقہ تفسیر کو روایتی سمجھکر اس کی تحقیر کریں
حالانکہ دوسری حیثیتوں کو چھوڑ کر اگر صرف زبان کے ماہر اور واقف کار ہی کی حیثیت سے ان مفسرین بالرو
کو دیکھا جائے تو بھی ان کا مرتبہ ہم سے آپ سے بمراتب اونچا ہوگا، یہ کوئی قدامت پرستی کی بات نہیں ہے
بلکہ واقعہ کا حقیقی پہلو ہو،

قرآن پاک کی تفسیر کا پہلا دور اسی طریقہ سے شروع ہوا، لیکن افسوس ہے کہ غیر ضروری تشریح

و توضیح کے لئے مسلمانوں نے ان مضامین میں جو قرآن پاک اور پہلے آسمانی صحیفوں میں اشتراک رکھتے تھے تو مسلم
اہل کتاب کی طرف رجوع کیا، اور ان سے سن سن کر اسرائیلی روایات کا بڑا حصہ قرآن پاک کی تفسیروں میں بھر دیا
محدثین نے ان اسرائیلیات سے بے اعتباری کا ہمیشہ اظہار کیا ہے، اور اسی لئے وہ حصہ ہماری تفسیروں کا نہ صرف
یہ کہ مفید نہیں، بلکہ بہت حد تک مضر اور قرآن پاک کے صحیح مطلب سمجھنے میں عائق ہو،

کسی کتاب کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے سب سے اہم چیز اس کتاب کی زبان اور اس زبان کے قواعد کی پیروی
ہے، یہ کسی طرح درست نہ ہوگا، کہ ہم عقلیت کے جوش میں اس کتاب کے کسی فقرہ کی تشریح میں اس زبان کے لغت
اور قواعد میں ایسا تصرف کریں، جو ہر حیثیت سے ناجائز ہو، اور ہمارے اس تصرف کا اصل منشا اتنا ہو کہ ہم اپنے
استبعاد عقلی کی تسکین کر سکیں، حالانکہ استبعاد عقلی کوئی یکساں چیز نہیں، اور نہ وہ خلاف عقل کے معنوں میں ہے، عقل
کی وسعت اور استبعادات عقلی کی فہرست ہر زمانہ میں گھٹتی اور بڑھتی رہی ہے، اس لئے قرآن پاک کی تفسیر کا یہ معیار
نہیں بتایا جا سکتا،

تاہم اس میں شک نہیں کہ ہر زمانہ کا ماحول دوسرے زمانہ سے بالکل الگ ہوتا ہے عقلی مسلمات اور زمانہ
کے غیر محسوس عقائد ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے ہر کتاب کے مفہوم و معنی کے سمجھنے میں اس زمانہ کے موثرات
سے قطع نظر کرنا کسی طرح ممکن ہی نہیں، ہر زمانہ کے لوگ اپنے زمانہ ہی کے موثرات کے مطابق کسی کلام کو سمجھنا
چاہتے ہیں، فانی انسانوں کے فانی کلام اور جزئی علم رکھنے والوں کے جزئی علم، اگر ایک زمانہ میں صحیح اور دوسرے
زمانہ میں غلط ہو جائیں تو ایسا ہونا بہت حد تک قرین قیاس ہے، مگر خدائے پاک کے کلام میں جس کا علم ازل
سے ابد تک کو محیط ہے اس قسم کا تصور بھی ذہن میں نہیں لایا جا سکتا، اس لئے اگر مخلص اہل علم اور نیک نیت علماء اس
کلام کی مزید تشریح اپنے زمانہ کے موثرات کے مطابق اس طرح کر سکیں کہ وہ متکلم کے اصول متواترہ مخاطب اول
صلعم کی تفہیم اور زبان کے لغت و قواعد کے خلاف نہ ہوں، تو ان کی یہ سعی مشکور ہوگی،

اسی بنا پر اُس زمانہ سے جب سے مسلمانوں میں عقلیات کا رواج ہوا، اس نظر سے بھی قرآن پاک کی تفسیریں

لکھی گئیں، معتزلہ میں ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر اور قاضی عبدالجبار معتزلی کی تنزیہ القرآن، اور اہلِ سنت میں امام ابو منصور ماتریدی کی تاویلات اور امام ابن فورک کی مشکلات القرآن امام محمد غزالی کی جواہر القرآن اور سب سے آخر میں ا[illegible] فخر رازی کی تفسیر کبیر اپنے اپنے زمانہ کے موثرات کی بہترین ترجمان ہیں،

زمانہ حال میں انسانوں کے علوم وفنون، رسم ورواج مسلمات اور عقائد عقلی میں جو انقلاب ہوا ہے اس نے بہت سے علمائے متفکرین کو اپنے زمانہ کے ماحول اور ضروریات کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر کی طرف متوجہ کیا اسوقت دنیائے اسلام کے وسیع رقبہ کی ترجمانی دو ہی ملک کر رہے ہیں، ہندوستان اور مصر اسلئے اس قسم کی تفسیر کی تحریک بھی انہی دو ملکوں کے مسلمان عالموں کے سینوں میں موج زن ہوئی، سرسید احمد خان نے ہندوستان میں اور مفتی محمد عبدہ نے مصر میں ادھر توجہ کی اور قرآن پاک کی آیات کی اپنے زمانہ کے خیالات کے مطابق تفسیر کی کوشش کی، سرسید کے حسنِ نیت میں شک نہیں، مگر افسوس کہ ان کے حسنِ نیت کے مطابق ان کے علم کا پایہ نہ تھا، اور نہ ان کو عربی زبان کے لغت وادب پر عبور تھا، اس لئے ان کی غلطیاں ان کی صحت سے زیادہ ہوئیں، اور خصوصاً فطرت اور قوانینِ فطرت کا جو تخیل ان کے زمانہ میں چھایا تھا، اس کی غلط پیروی نے انکو حق کے جادہ سے ہٹا ہٹا دیا،

اس کے بعد مصر میں سید رشید رضا اور ہندوستان میں مولینا عبدالحمید فراہی کا دور شروع ہوا، یہ دونوں گو اصول میں مختلف تھے، مگر نتیجہ میں بہت حد تک متفق تھے، سید رشید مرحوم آثار و روایات کی چھان بین کرکے آیات کو روحِ عصری سے مطابق کرتے تھے، اور فراہی رحمۃ اللہ علیہ خود قرآن پاک کے نظم ونسق اور قرآن [illegible] کی دوسری آیتوں کی تطبیق اور کلامِ عرب کی تصدیق سے مطالب کو حل کرتے تھے،

اسی زمانہ میں مصر میں دو اور تفسیروں کی تالیف شروع ہوئی، ایک نئے تعلیم یافتہ فاضل فرید وجدی کے قلم سے جن کا مقدمۂ تفسیر تو میں نے دیکھا ہے، مگر اصل تفسیر کا حال معلوم نہیں، دوسری ایک ایسے فاضل کے قلم سے جو یورپ کے علوم وفنون اور ترقیات سے پوری طرح واقف اور اپنے گھر کی قدیم دولت سے بھی

آشنا ہے، یعنی حضرت شیخ طنطاوی جوہری جو جامعہ مصریہ اور مدرسہ دارالعلوم میں ایک زمانہ تک علوم وفنون کے مدرس رہ چکے تھے، موصوف کو اس تفسیر کا خیال جدید طلبہ میں قرآن پاک سے عقیدت کا رشتہ مستحکم رکھنے کے ذریعہ سے آیا، انھوں نے آہستہ آہستہ مغربی علوم وخیالات سے سرمست طالب علموں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے ان کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کی تفسیر وتشریح نئے ڈھنگ سے کی،

شیخ طنطاوی جوہری کی تفسیر کی اصل غایت مسلمانوں کو نئے علوم وفنون کی طرف متوجہ کرنا، اور مسلمانوں کو یہ باور کرانا ہے کہ ان کا یہ تنزل اسوقت تک دور نہ ہوگا جب تک وہ جدید سائنس اور دوسرے نئے علوم اور یورپ کے جدید آلات اور علمی ومادی قوتوں سے مسلح نہوں گے،

ہندوستان میں اسی خیال نے تذکرہ کی صورت اختیار کی ہے، مگر افسوس ہے کہ جو غلطی سرسید سے ان کے زمانہ میں ہوئی، وہی صاحب تذکرہ سے اس زمانہ میں ہو رہی ہے، مسلمانوں کو یورپ کے علوم وفنون اور مادی قوتوں کی تحصیل کی طرف متوجہ کرنا بالکل صحیح ہے، مگر اس کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے، کہ ہم اپنے سارے تیرہ سو برس کے سرمایہ کو آگ لگا دیں، اور پہلے کے سارے مفسرین اہلِ لغت، اہلِ قواعد، اور اہلِ علم کو ایک سرے سے جاہل دشمنِ اسلام اور احمق کہنا شروع کریں، ورنہ آیندہ جب زمانہ کا ورق پلٹے گا، موثرات اور ماحول میں تغیر ہوگا، تو ان خوش فہموں کی تفسیریں اور تاویلیں بھی ایسی ہی غلط اور دور از کار اس زمانہ میں نظر آئیں گی جیسی آج ان کی نگاہ میں امام ماتریدی، ابن فورک، امام غزالی اور امام رازی کی تفسیریں معلوم ہوتی ہیں،

خدا کا کلام بحرِ ناپیدا کنار ہے، اسکی موجوں کی گنتی کون کر سکتا ہے، بس جسکو جو کچھ نظر آتا ہے، وہ ایمانداری اور دیانت کیساتھ اس کی تشریح کرے، لیکن جو کچھ اگلوں کو نظر آیا، جو ان کی نظروں سے اوجھل ہے اسکو نادانی وجہالت نہ کہیں، اور جو آیندہ نظر آئے گا، اس کا انکار نہ کریں، اور صرف اپنی ہی نظر کی وسعت کو جو زمان و مکان کی قیود میں گھری ہے، تحقیق کی انتہا اور صحت کا معیار قرار دے لیں،

شیخ طنطاوی کی تفسیر کی خوبی یہی ہے، کہ گو انھوں نے قرآن کی آیتوں کی تشریح میں سائنس اقتضا[illegible]

اور موجودہ زمانہ کے دوسرے علوم وفنون وتحقیقات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنے ناظرین کے دل ودماغ کو ادھر متوجہ کیا ہے، اور مسلمانوں کو اپنی حالت پر غور کرنے اور ترقی کے اصول سمجھنے کی دعوت دی ہے، پھر بھی وہ پچھلے مفسروں کی تحقیقات کی تحقیر نہیں کرتے، مسلمان عالموں کا دل نہیں دکھاتے، اور نہ مذہب کے نام سے لوگوں کو مادیت اور بے دینی کی تعلیم دیتے ہیں،

انھوں نے اپنی تفسیر کا مقصد، کتاب کے شروع ہی میں چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے[1]:۔

"آج خدا کے بھروسہ پر میں تفسیر کا سلسلہ پھر شروع کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ جو دل میں متمکن ہے، کہ اس تفسیر سے اللہ تعالیٰ کچھ دلوں کو کھول دے گا، اور کچھ قوموں کو راہ دکھائیگا اور عام مسلمانوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیگا، تو وہ علوم کونیہ (سائنس) کو سمجھیں گے، اور مجھے امید ہے، کہ اللہ تعالیٰ اسی امت کے ذریعہ سے اس دین کی مدد فرمائے گا، اور مسلمان اس تفسیر کی روش پر کام شروع کریں گے، اور ساری دنیا میں وہ مقبول ہوگی، اور نوجوان مسلمان آسمان اور زمین کے عجائب وغرائب احوال کی واقفیت کا شوق پیدا کریں گے، اور اللہ تعالیٰ انکی تہذیب وشائستگی کو بلندی بخشے گا، اور یہ کتاب فطرت کے قوانین کی معرفت کی دعوت دیگی، اور اس امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو یورپ والوں سے زراعت، طب، معدنیات، حساب، انجینیرنگ اور دیگر علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں ترقی کر جائیں گے، اور کیونکر ایسا نہو، کہ قرآن پاک میں وہ آیتیں جن میں علوم کا ذکر، یا ان کی طرف اشارے ہیں، ساڑھے سات سو سے زیادہ ہیں، اور خالص احکام فقہی کی آیتیں ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں، اور میں نے اس تفسیر میں وہ تمام باتیں بیان کی ہیں، جن کی ضرورت مسلمانوں کو ہے، یعنی احکام، اور اخلاق، اور سائنس کے عجائبات، اور میں نے اس میں جدید علوم کی نادر تحقیقات اور فطرت کے وہ قوانین

[1] جلد اول ص ۲، و ۳،

بیان کر دیئے ہیں جو مسلمان مردوں اور عورتوں میں حیوانات ونباتات اور زمین وآسمان کی تحقیقات کا شوق پیدا کر دیں گے، اور تمہیں معلوم ہو جائے گا، کہ یہ تفسیر ربانی لطف وکرم کا نتیجہ ہے، اور اس میں اس بشارت کا رمز چھپا ہے، کہ یہ تفسیر آیندہ ان لوگوں کی ترقی کا سبب بنے گی، جو آج زمین میں کمزور سمجھے جاتے ہیں، اور خدا اسکی مدد کرے گا، جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شبہہ اللہ زبردست قوت والا ہے"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس تفسیر کی تالیف سے انھوں نے زمانہ جدید کے علوم عصریہ کے مقابلہ میں وہی خدمت انجام دی ہے، جو آج سے ساڑھے سات سو برس پیشتر امام فخر الدین رازی نے قدیم یونانی علوم کے مقابلہ میں انجام دی تھی، اور اسی لئے یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا، کہ شیخ طنطاوی کی یہ تفسیر چودہویں صدی کی تفسیر کبیر ہے،

اس تفسیر کو پڑھ کر جدید تعلیم کے نوجوانوں کو معلوم ہوگا، کہ قرآن پاک فطرت کے اسرار اور سائنس کے عجائبات کے استدلال سے پُر ہے، اور یہ بجائے خود رسول امی محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت اور قرآن کے اعجاز معنوی پر ناقابل تردید شہادت ہے،

حضرت مولینا سید انور شاہ صاحب کشمیری بھی اس تفسیر کی اس افادی حیثیت کے مداح تھے، کہ اس نے آیات کریمہ سے متعلق جدید علوم ومسائل پوری تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں[1]،

مصنف نے اس تفسیر میں جو نئی باتیں لکھی ہیں، وہ زیادہ تر توضیح اور استشہادی ہیں، اس لئے اس میں جدّت کے باوجود بدعت نہیں پیدا ہوئی ہے، اور آج کل کے بعض غلط رو عجمی مدعیان تفسیر کی طرح زبان اور زبان کے قواعد، اصول اور لغت سے دست بردار ہو کر زمانۂ جدید کی خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے،

[1] نفحة العنبر من ہدی الشیخ الانور، ص ۹۱،

ضرورت تھی کہ اس تفسیر کا ترجمہ کوئی فاضل ہندوستانی عالم اپنی زبان میں کرتا، کہ دنیائے اسلام کا وہ براعظم جہان قرآن کے مومن سب سے زیادہ بستے ہیں، اس سے فائدہ کا فیض پا سکتا، جامعۂ دارالسلام عمرآباد کے لائق مدرس مولوی عبید الرحمٰن صاحب حمانی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھون نے بڑی محنت سے اس کا ترجمہ کیا، اور کاکا محمد اسمٰعیل صاحب اور ان کے بھائی کاکا محمد ابراہیم صاحب (عمرآباد مدراس) بھی مبارکباد کے سزاوار ہیں، کہ انھوں نے اس تفسیر کو اپنے سرمایہ سے چھپواکر اپنی دولت کو صحیح مصرف میں صرف کر کے ثواب دارین حاصل کیا، جزاھم اللہ خیر الجزاء، ابھی تو صرف یہ پہلی جلد کا ترجمہ ہے، امید کہ باقی جلدیں بھی ہماری زبان میں منتقل ہوکر ہمارے نوجوانوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دین،

اسوۂ صحابہؓ جلد اول

حضرات صحابہ کے عقائد، عبادات اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر اور قرون اولیٰ کے اسلام کا عملی خاکہ، اس کا مطالعہ ہر مسلمان پر فرض ہے، ضخامت ۴۲۲ صفحے قیمت :- عہ/

اسوۂ صحابہ جلد دوم

صحابہ کے سیاسی انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل ضخامت ۴۸۰ صفحے، قیمت عہ/

سیرت عمر بن عبد العزیز

حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفۂ اموی کے سوانح حیات، اور ان کے مجددانہ کارنامے، طبع دوم قیمت :- عہ/ ضخامت ۱۵۰ صفحے،

"منیجر"

فلسفہ کا حاصل

از

از مولینا عبد الباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(۲)

جب شعور اور تجربات شعور کے سوا ہماری دنیا کچھ نہیں، تو خواہ ارتسامات ہوں خواہ تصورات، ایک تجربہ یا ادراک کا دوسرے سے فرق اور تعلق نفس شعور کی حد تک، تو بہرنوع وہی رہیگا، جو شعور میں آتا ہی، اسکے خلاف کا ہم کسی طرح تصور نہ کر سکین گے، مثلاً وہ وجوبی یا ضروری صداقت جس کو قانون عینیت کہا جاتا ہی کہ "الف" "الف" ہی، اس کے معنی یہ ہوتے ہین، کہ وہ ادراک جس کو "الف" کہا جاتا ہے، اسکو ہمیشہ "الف" ہی کہا جائے گا، علیٰ ہذا اس صداقت کے، کہ دو مستقیم خط کسی جگہ کو گھیر نہیں سکتے، معنی یہ ہوتے ہیں، کہ نہ ہم کو ایسا ہونا یاد ہے، اور نہ آیندہ ایسا ہونے کی توقع قائم کر سکتے ہیں، میرے ذہن میں اس وقت اس وجوبی صداقت کا خیال موجود ہے، جس کا انکار کرنا خود انکارِ شعور کو مستلزم ہوگا[1]، اسی طرح سرخ اور نیلے میں فرق اور اختلاف کا جو خیال یا شعور میرے ذہن میں پایا جاتا ہی، اس کا انکار بھی نفس اس شعور ہی کا انکار ہو جائے گا، بقول ڈیکارٹ ہم ہر شے سے انکار کر سکتے ہیں، مگر نفس اپنے کسی خیال یا شعور سے کہ میں فلان بات کا خیال کر رہا ہون، یا مجھ کو اس کا شعور ہو رہا ہے، انکار کی کیا صورت ہی،

امور واقعیہ اور علائق تصوریہ کی تقسیم اور تفریق بجائے خود صحیح ہو یا غلط، لیکن ہیوم کی بحث تعلیل (علت اور معلول .) کا تعلق بہرحال صرف اس سے ہے کہ ہم جن چیزوں میں علت اور معلول کا رابطہ اور علاقہ سمجھتے

[1] مجموعہ مضامین ہکسلے، جلد ۶ صفحہ ۱۶۸

ہیں، اُن میں نہ علت میں کوئی ایسی شے پاتے ہیں، جس کی بنا پر دعوی کرسکیں، کہ اس سے وجوبًا و
فلان معلول کو ظاہر ہونا چاہئے، اور نہ معلول میں کوئی ایسی شے پاتے ہیں، کہ اس کو لازمًا فلاں علت
نتیجہ ہونا چاہئے،

تم کسی کے سامنے خواہ وہ کتنا ہی ذہین اور طباع شخص ہو، ایک بالکل ہی نئی چیز رکھدو، پھر
کہ وہ اس کے نفس صفات پر غور و خوض میں لاکھ سر مارے، اور اپنی ساری دقتِ نظر صرف کر ڈالے
خالی ان صفات سے اس چیز کے اندر نہ کسی علت کا پتہ چلا سکے گا، نہ معلول کا، فرض کرو کہ کوئی شخص
بہیں پانی دیکھے، تو کیا وہ محض اسکی رقیق اور شفاف ہونے کی صفتوں سے یہ نتیجہ نکال لیگا، کہ اس میں
سے لازمًا دم گھٹ جانا چاہئے، یا آگ کی خالی روشنی اور حرارت سے یہ اخذ کرسکے گا، کہ یہ جلا کر خاک
کردیگی، مقناطیس کو دیکھکر صرف عقل اور قیاس سے یہ کون بتا سکتا ہے، کہ اس میں کشش کی طاقت ہوگی
یا روٹی کی صرف محسوس صفات سے یہ کون حکم لگا سکتا ہے کہ یہ آدمی کی غذا تو ہو سکتی ہے، لیکن شیر کی نہیں

اگر پانی کے بجائے پتھر پر چلنے سے ہم کو یہ تجربہ ہوتا، کہ اس میں آدمی ڈوب جاتا ہے، اور پانی پر
طرح دوڑتے ہوئے چلنے کا تجربہ ہوتا جس طرح آج زمین یا پتھر پر ہوتا ہے، تو کیا ہم یہ کہتے اور نہ سمجھتے
پانی یا رقیق شے کے برخلاف پتھر یا سخت مٹی کا خاصہ غرق کر دینا ہے، یا اگر شیر گھاس کھاتا اور بکری گو
تو کیا ہم کسی عقلی اور حسی شہادت کے زور سے یہ دعوی کرسکتے تھے، کہ نہیں شیر کی غذا گوشت اور بکری کی
گھاس ہونی چاہئے، یا مقناطیس کے بجائے سنگ مرمر میں اگر ہم کشش پاتے تو کیا کسی طرح بھی کہہ سکتے
تھے کہ نہیں سنگ مرمر میں ہرگز کشش نہ ہونی چاہئے، مقناطیس ہی میں ہونی چاہئے،

"معلوم ہوا کہ مختلف واقعات میں باہم لزوم اور ضرورت کا تصور کسی ایک واقعہ اور مثال کے الٹنے
پلٹنے سے کسی طرح نہیں حاصل ہو سکتا، بلکہ ایک ہی قسم کی بہت سی ایسی مثالیں سامنے آنے سے
پیدا ہوتا ہے، جن میں ایک واقعہ دوسرے کے ساتھ برابر لحق رہا ہو، لیکن ان مثالوں کی کثرت سے

کوئی ایسی نئی اور مختلف بات نہیں مل جاتی، جو ایک مثال میں نہ ملتی ہو، بجز اس کے کہ یکسان جزئیات
کے بار بار اعادہ اور تکرار سے عادۃً ذہن ایک واقعہ کے ظہور سے دوسرے کا جو معمولاً اس کے
ساتھ رہا ہے، متوقع ہو جاتا ہے، اور یقین کر لیتا ہے کہ اس کے بعد وہ بھی وجود میں آئے گا، لہٰذا
یہی ارتباط جو ہم خود اپنے ذہن مین محسوس کرتے ہیں یعنی تخیل کا بر بنائے عادت، ایک واقعہ سے
دوسرے کی طرف منتقل ہو جانا، وہ احساس یا ارتسام ہے، جس سے ہم قوت و لزوم یا رابطہ
ضروری کا تصور حاصل کرتے ہیں، بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا، ہر پہلو سے اچھی طرح
الٹ پلٹ کر دیکھ لو، اس انتقالِ ذہن کے علاوہ لزوم اور قوت کے تصور کیلئے تم کو کوئی اور
اصل یا ماخذ نہیں مل سکتا،...... پہلی دفعہ جب آدمی نے دیکھا ہوگا، کہ دھکے یا دفع سے حرکت
پیدا ہوئی، مثلاً بلیرڈ کے دو گیندوں کے ٹکرانے سے، تو یہ حکم وہ ہرگز نہ لگا سکتا ہوگا، کہ ان
میں سے ایک واقعہ دوسرے کے ساتھ لزومًا اور وجوبًا وابستہ ہے، بلکہ فقط اتنا کہہ سکتا ہوگا
کہ اس کے ساتھ الحاق رکھتا ہے، لیکن جب وہ اس طرح کی متعدد مثالیں یا واقعات دیکھتا ہے،
تو پھر دونوں کی باہمی وابستگی کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے، کیا فرق ہو گیا جس نے وابستگی کا یہ نیا
تصور پیدا کر دیا؟ اس کے سوا کچھ نہیں، کہ اب وہ اپنے تخیلہ میں ان واقعات کو باہم وابستہ محسوس
کرنے لگا ہے، اور ایک کے ظاہر ہونے پر دوسرے کی پیشین گوئی کر سکتا ہے، لہٰذا جب ہم کہتے ہیں
کہ ایک شے دوسری سے وابستہ ہے، تو مراد صرف یہ ہوتی ہے، کہ ہمارے ذہن
یا متخیلہ مین انھون نے ایسی وابستگی حاصل کر لی ہے کہ ہم ایک سے دوسرے کا
وجود مستنبط کرتے ہین[1]؛

"علت کی صحیح تعریف و تحدید نا ممکن ہے، یکسان واقعات ہمیشہ دوسرے یکساں ہی واقعات

[1] فہم انسانی ص۸۵،

کیں تھی تھتی سے ہیں، یہ ایک تجربہ ہے، جس کے مطابق علت کی تعریف یہ ہو سکتی ہے، کہ "وہ ایک ایسی چیز کا نام ہے، جس کے بعد دوسری چیز ظاہر ہوتی ہے، اور تمام چیزیں جو پہلے سے مماثل ہیں، ان کے بعد ہمیشہ ایسی ہی ایسی ہی چیزیں وجود میں آتی ہیں، جو دوسری سے مماثل ہوتی ہیں" یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ "اگر پہلی چیز نہ پائی جائے تو دوسری کبھی نہ پائی جائے گی" اسی طرح ایک دوسرا تجربہ یہ ہے، کہ علت کے سامنے آنے سے عادت کی بنا پر ذہن ہمیشہ تصور معلول کی طرف دوڑ جاتا ہے، جس کے مطابق علت کی ہم ایک اور تعریف یہ کر سکتے ہیں، کہ "وہ نام ہے ایک چیز کے بعد دوسری کے اس طرح ظاہر ہونے کا، کہ پہلی کے ظہور سے ہمیشہ دوسری کا خیال آجائے" گویہ دونوں تعریفیں ایسے حالات سے ماخوذ ہیں، جو نفس علت سے خارج ہیں، تاہم ہمارے پاس اس کا کوئی چارۂ کار نہیں، نہ ہم علت کی کوئی ایسی حد تام بیان کر سکتے ہیں، جس سے اس کے اندر کسی ایسی شے کا سراغ مل جائے جو اس میں اور معلول میں موجب ربط ہوئی ہو، اس ربط کا ہم کو قطعاً کوئی تصور نہیں حاصل، بلکہ جب ہم اسکو جاننا چاہتے ہیں تو صاف طور پر یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا جاننا چاہتے ہیں، مثلاً ہم کہتے ہیں، کہ فلاں تار کی لرزش فلاں آواز کی علت ہے، لیکن اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟ یا تو یہ کہ "اس لرزش کے بعد یہ آواز ظاہر ہوتی ہے، اور اسی طرح کی تمام لرزشوں کے بعد ہمیشہ اسی طرح کی آوازیں ظاہر ہوتی رہی ہیں" یا پھر یہ کہ "اس لرزش کے بعد یہ آواز ظاہر ہوتی ہے، اور ایک کے ظہور کیساتھ ہی ذہن فوراً دوسری کے احساس کا متوقع ہو جاتا ہے، اور اس کا تصور پیدا کر لیتا ہے" علت اور معلول پر بحث کی بس یہی دو راہیں ہیں، جن کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے"[1]

جس طرح نفس اشیا یا محسوسات کے اندر ہم کو کسی علیت، قوت، اور خاصیت یا باہم کسی ربط اور

[1] فہم انسانی ص ۷۶،

وابستگی کا مطلق کوئی سراغ نہیں ملتا، اسی طرح خود اپنے افعال ذہن یا احوال شعور پر غور و فکر کرنے سے بھی اس کا کوئی نشان نہیں پاتے، بلاشبہ جب ہم ہاتھ اٹھانیکا ارادہ کرتے ہیں، تو وہ اٹھ جاتا ہے، ہاتھ ہی کیا جب ہم چلنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو ارادہ کے محض اسی ایک ذہنی فعل یا شعور سے ہمارا پانچ چھ فٹ کا سارا جسم حرکت میں آجاتا اور چلنے لگتا ہے، ہم نے لکھنے کا ارادہ کیا نہیں کہ انگلیاں حرکت میں آکر قلم کو چلانے لگیں، یہ ہر وقت کا ایک بیش پا افتادہ تجربہ ہے، لیکن ایسا کیونکر ہوتا ہے؟ ارادہ کی خالی ایک نفسیاتی جنبش میں کیا ایسا جادو ہے کہ دو گز کا جسم دوڑنے لگتا ہے، اس راز کو کون کھول سکتا ہے؟

"کہا جا سکتا ہے کہ ہم کو ایک باطنی قوت کا ہر آن شعور ہوتا رہتا ہے، کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ محض اپنے ارادہ سے اپنے اعضائے جسم کو حرکت دے سکتے ہیں، یا اپنے ذہنی قویٰ سے کام لے سکتے ہیں، ارادہ کا عمل ہمارے اعضاء میں حرکت یا ذہن میں نیا تصور پیدا کر دیتا ہے، اور وہ اس اثر کو ہم خود اپنے شعور سے جانتے ہیں، لہٰذا یہیں سے ہم قوت یا انرجی کا تصور حاصل کرتے ہیں،......"[1]

"بیشک ہم کو ہر لحظہ اس کا شعور ہوتا رہتا ہے، کہ ہمارے جسم کی حرکت ہمارے ارادہ کی تابع ہے، لیکن وہ ذریعہ جس سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے، وہ انرجی جس کی بدولت ارادہ سے ایسا عجیب و غریب فعل صادر ہوتا ہے، اسکے شعور و احساس سے ہم اسقدر دور ہیں، کہ انتہائی کوشش تحقیق پر بھی ہمیشہ ہمارے علم کی گرفت سے باہر ہی رہے گی"[2]

"کوئی اصول بھی اتنا پر اسرار نہیں، جتنا کہ روح کا جسم کیساتھ اتحاد جس کی بنا پر مانا جاتا ہے کہ کوئی نامعلوم جوہر روحانی جوہر مادی پر اس طرح موثر ہے، کہ لطیف سے لطیف خیال کثیف سے کثیف مادہ پر عمل کرتا ہے، اگر ہم کو یہ قدرت حاصل ہوتی کہ ہمارے اندر کسی مخفی خواہش

[1] فہم انسانی ص ۱، [2] ۵۲، ر ص ۴۲

یا ارادہ سے پہاڑ چلنے لگتے، یا سیاروں کی گردش ہمارے قابو میں آجاتی، تو وہ بھی اس سے زیادہ غیر معمولی یا فوق الفہم بات نہ ہوتی، جتنا کہ روح کا جسم پر عمل ہے[1]؛

ایک طرف تو ارادہ کی پر اسراری کا یہ عالم ہے، کہ اگر اس سے پہاڑ چلنے لگیں یا سیارے رک جائیں تو یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی، دوسری طرف اسکی بے بسی یہ ہے کہ خود اپنے جسم کے تمام اعضاء پر بھی مساوی قدرت نہیں حاصل، نہ ہم اس اختلاف کا سبب بجز تجربہ کے کچھ اور بتا سکتے ہیں، کہ ارادہ زبان اور انگلیوں کی حرکت پر تو قابو رکھتا ہے، لیکن قلب اور جگر کی حرکت پر اس کا کوئی بس نہیں، ؟ حالانکہ اگر خود اس قوت کا ہم کو کوئی علم یا شعور ہوتا، جو زبان اور انگلیوں کو متحرک کر سکتی ہے، مگر قلب اور جگر پر اختیار نہیں رکھتی، تو یہ سوال ہرگز نہ پیدا ہوتا، کیونکہ اس صورت میں ہم تجربہ سے قطع نظر کرکے بتا سکتے، کہ ارادہ کی حکومت اعضاے جسم پر ایک خاص دائرہ کے اندر ہی کیوں محدود ہے[2]؟

یہ طویل اقتباسات ہیوم کے نظریۂ علت و معلول کی قریبًا ساری تفصیلات اور تمام اجزاء کا نچوڑ ہیں، جنکو مختصرًا حسب ذیل نتائج میں پیش کیا جاسکتا ہے:-

۱- نفس اشیاء (اگر ان کا وجود ہو بھی) میں نہ کسی قسم کی علیت ہے نہ قوت، نہ خاصیت، نہ فعل، نہ اثر یا کم از کم ہم کو ان کے ہونے کا قطعاً کوئی علم نہ ہے نہ ہو سکتا ہے،

۲- اسی طرح احوال شعور یا ارادہ کے اندر بھی ہم کو کسی قوت، علیت یا انرجی کا مطلقًا علم و ادراک نہیں،

۳- باقی جس چیز کو ہم علیت یا قوت کہتے اور سمجھتے ہیں، اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں، کہ گذشتہ تجربات میں ایک خاص قسم کا واقعہ دوسرے خاص قسم کے واقعہ کے بعد ہمیشہ علی الاتصال ظاہر ہوتا رہا، جس کو محض بر بنائے عادت آیندہ بھی ذہن اسی کا متوقع ہو جاتا ہے، اور ایک کے ظہور سے دوسرے کے ظہور کی پیشین گوئی کر سکتا ہے،

---

[1] فہم انسانی ص [illegible]، [2] ص [illegible]

۴- علت اور معلول میں باہم جو وجوب اور لزوم ہم محسوس کرتے ہیں، اس کا تصور تمام تر اسی ذہنی عادت کے ارتسام سے ماخوذ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہو، کہ علیت اور قوت یا وہ وجوب اور ضرورت جو علت اور معلول کے مابین ہم پاتے ہیں، وہ نہ خود اشیاء کے اندر کوئی واقعہ ہوتا ہے، نہ احوال شعور یا ارادہ کے اندر، بلکہ وہ ہمارے ذہن اور تخیل کے ایک خالص عادی ربط اور ائتلاف کا نام ہے،

۵- لازمًا جس چیز کو قانون فطرت کہا جاتا ہے، وہ خود اشیاء کی فطرت کا کوئی قانون نہیں، بلکہ کلیتہً ہمارے ذہن کی فطرت کا ایک قانون ہے،

۶- اور اس لئے خود اشیاء میں بالذات نہ ہم کسی بات کو خلاف فطرت کہہ سکتے ہیں، اور نہ اس کے وقوع کو بالذات محال اور ناممکن قرار دے سکتے ہیں،

۷- لیکن ان سب سے اہم اصلی اور کلی نتیجہ جو نکلتا ہے، وہ ارتیابیت یعنی فلسفہ کی ناکامی اور نارسائی کا اقرار ہے جسکو خود ہیوم ہی کی زبان سے سننا چاہیئے،

"کوئی شے اپنے نتائج سے زیادہ ارتیابیت یا تشکیک کی موید نہیں ہو سکتی، جس سے انسانی عقل اور صلاحیت کی کمزوری اور نارسائی کا راز فاش ہوتا ہو،

زیر بحث مسئلہ سے بڑھ کر ہماری عقل اور فہم کی حیرت انگیز کمزوری کی اور کون سی مثال پیش کیجا سکتی ہے، ؟ کیونکہ اشیاء کے باہمی علائق میں اگر کسی علاقہ کا کما حقہ جاننا ہمارے لئے از بس اہم ہے، تو وہ یقینًا علت اور معلول کا علاقہ ہے، واقعات اور موجودات سے متعلق ہمارے سارے استدلالات اسی علاقہ پر موقوف ہوتے ہیں، صرف یہی ایک ذریعہ ہے، جس کی بدولت ہم ان چیزوں پر کوئی یقینی حکم لگا سکتے ہیں، جو حافظہ یا حواس سے دور ہیں، تمام علوم کی اصلی غرض و غایت فقط یہی ہے، کہ علل و اسباب کو جان کر آیندہ کے واقعات کو قابو اور انضباط میں لایا جاسکے، اسی لئے ہماری ساری فکر و کاوش ہمہ وقت اسی علاقہ پر مصروف رہتی ہے، بااین ہمہ اس کی نسبت ہمارے

تصورات اتنے ناقص ہیں، کہ بجز چند خارجی اور سطحی باتیں بیان کر دینے کے علت کی صحیح تعریف ناممکن ہے[1]"

چلئے انسانی علم اور یقین کا یہ سہارا بھی ختم ہوا،

نہ ہم رنگ و روشنی، آواز و مزہ، سردی و گرمی، نرمی و سختی، شکل و صورت، وزن و امتداد وغیرہ حواسی ادراکات کی محض شعوری حیثیت کے آگے کچھ جانتے اور بتا سکتے ہیں، کہ ان کا محل و منشا، کوئی خارجی یا مادی جوہر ہے، نہ خود اپنے ذہنی یا شعوری احوال، فکر و ارادہ، محبت و نفرت، رنج و راحت وغیرہ مختلف کیفیات شعور کا نفس شعور کے علاوہ کوئی غیر مادی یا روحانی محل و منشا معلوم، بس لے دے کر صرف شعوری ادراکات و کیفیات گویا ایک معلق صورت میں رہجاتی ہیں، جو نہ زمین میں ہیں، نہ آسمان میں، یعنی نہ ان کے مادہ میں پائے جانے کا علم ہے، نہ روح میں ہونے کا یقین،

ایک آخری سہارا یہ رہجاتا تھا، کہ ان معلق احساسات اور تصورات میں باہم ایک حقیقی ربط اور تعلق بہرحال پایا جاتا ہے، جس کا نام علت اور معلول کا لزومی اور ضروری تعلق تھا، مگر یہ لزوم بھی تمامتر ہمارے متخیلہ یا واہمہ کی خلاقی کا ایک کرشمہ نکلا، جس کے سوا نہ علت کے اندر کچھ حقیقت معلوم ہے، نہ معلول کے اندر، نہ اشیا کے خارج میں (اگر ہوں) کہیں اس لزوم اور وجوب کا نشان ملتا ہی، نہ افعال باطن میں،

ہیوم کی اس ارتیابیت کو کانٹ صرف ماوراے تجربہ چیزوں تک نارسائی سمجھا، لیکن دراصل ہیوم جس نتیجہ پر پہونچا، یا ہم کو پہونچاتا ہے، اس کی رو سے عقل تجربہ کی دنیا میں بھی معزول ہو جاتی ہے، اور اسکے نزدیک تجربات کی دنیا میں بھی عقل کی نہیں، بلکہ ایک غیر عقلی عادت کی حکومت ہے،

درحقیقت ہیوم کی یہ ارتیابیت خود تجربیت ہی کی تکمیل اور اس کا لازمی نتیجہ ہے، حواس کے فراہم کردہ منتشر ادراکات میں نفس عقل قطعاً کوئی جوڑ اور ربط نہیں پیدا کر سکتی، نہ ان پراگندہ ادراکات اور تصورات کے

[1] فہم انسانی باب فصل ۳،

آگے ایک قدم اٹھا سکتی ہے، گویا شے بذات خود اور صداقت کا خیال ہی سرے سے پادر ہوا جاتا ہے،

"کائنات خارجی کا وجود، جو نوع انسان کا ابتدائی اور عالمگیر مسلمہ ہے، یہ تو فلسفہ کے نہایت ہلکے چھینٹے سے بہ جاتا ہے، اب رہے نرے تصورات، ان کے مابین بھی جب عقل کسی حقیقی ربط اور علاقہ کی سراغ رسانی سے عاجز ٹھہری تو سارا فلسفہ ہی فنا ہو جاتا ہے،!!(انسائیکلوپیڈیا)

ظاہر ہے کہ جب وہ ایک ہی ذریعہ جنکی بدولت ہم حواس سے آگے کوئی قدم اٹھا سکتے تھے، ایسا ناکارہ بلکہ بے معنی ہے، کہ اس کے کوئی معنی تک ٹھیک نہیں سمجھے سمجھائے جا سکتے، تو پھر یہ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کی ناکامی کیا قطعاً اسکی موت کا اعلان ہے؟ اسلئے کہ فلسفہ خصوصاً فلسفہ مابعد الطبیعیات نے تو اپنا سب سے بڑا کارنامہ یہی بتایا تھا کہ وہ ہم کو احساسات اور ادراکات سے "مابعد" اور ماوراء بلکہ وراء الوراء کی سیر کرانا چاہتا ہے، وہ صرف علتوں ہی کی نہیں، بلکہ تمام علتوں کی علت اور سب غیبوں کے غیب کی خبر لگاتا ہے، وہ علت اور معلول، زمان اور مکان، مادہ اور روح کے بھیدوں کو کھولتا ہے، خلاصہ یہ کہ ہستی کے سارے راز کو بے نقاب کر دینا اس کا اصلی کام تھا، مگر معلوم ہوا کہ ہم پیاس کی بدحواسی میں سراب کی طرف دوڑے جا رہے تھے، اور ہزاروں سال کی کوششیں محض ایک عبث کاوش تھی، ورنہ ہم کبھی اس قابل ہو ہی نہیں سکتے، کہ علت العلل کی کوئی تشفی بخش توجیہ یا عقدہ کشائی کر سکیں، کیونکہ انتہائی اصول اور مبادی کا دروازہ انسانی علم اور تحقیق کے لئے قطعاً بند ہے، کشش ثقل، التصاق اجزا، حرکت، دفع وغیرہ بس یہی کائنات فطرت کے وہ آخری اصول و علل کہے جا سکتے ہیں، جہاں پہونچکر ہمارے علم اور انکشاف کی رسائی ختم ہو جاتی ہے" مکمل سے مکمل فلسفہ طبعی بھی صرف یہ کرتا ہے، کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے، جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے، کہ ہمارے اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے" مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرار کائنات کی نہیں، صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے، اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے، تو انسان کی کمزوری اور کور چشمی کا تماشا دیکھنا دکھانا، جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود

بار بار دوچار ہونا پڑتا ہے،[1]

جب ہم اس شک کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتے، کہ ہزاروں بار کے تجربہ کے بعد ہم کیوں یقین کر
لگتے ہیں کہ اگر پتھر کو اوپر پھینکا جائے، تو وہ لوٹ کر نیچے گر پڑے گا، اور آگ جلا دیگی، تو کیا کائنات کے آغاز او
اور فطرت کی ابتدا کے متعلق ہم کبھی بھی قطعی اور تشفی بخش نظریات قائم کر سکتے ہیں؟؟[2]

چراغ کے نیچے اندھیرا اس مثل کا نہایت حسرتناک تجربہ خود انسان کے اندر بہت زیادہ ہوتا رہتا ہے، کہ
اپنی عقل اور علم کی روشنی سے جو کچھ اور جہاں تک دوسروں کو دکھا دیتا ہے، بارہا خود نہیں دیکھتا، کیسی بوالعجبی
کہ "**انسانی فہم**" جس کتاب کی تحقیق کا خاتمہ صرف "**انسانی نافہمی**" پر ہوتا ہے، اسی میں "خدا و آخرت جز
جیسے کائنات کے آغاز اور انجام" سے متعلق ماورائی مباحث پر مستقل ابواب موجود ہیں جن میں کھلے چھپے کہیں
اور کہیں دوسروں کے پردے میں نظریات قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور تو اور جس کتاب میں انکار نبو
کے سب سے بڑے سہارے قانون فطرت اور قانون علت یا خود اشیاء کے اندر کسی قوت و خاصیت کی موجودگی
یقین کو ہمیشہ کے لئے دفن کیا گیا ہے، اسی کے پورے ایک باب میں معجزات کا نہایت شد و مد سے انکار ہے[3]

پھر اس کتاب کے علاوہ نفس مذہب پر جس کی نوعیت ہی تمامتر مابعد الطبیعیاتی اور ماورائی ہے،
جس کا سارا تعلق ہی کائنات کے "آغاز و انجام" سے ہے، اس پر "مذہب کی طبعی تاریخ"[4] کے نام سے ایک الگ ر
یا مقالہ لکھا گیا ہے، جس میں فطرت شناسی اور تاریخ دانی کی یہ داد دی گئی ہے، کہ مذہب کی اصل و فطری صو
شرک اور بت پرستی ہے، توحید اور خدا پرستی بعد کی پیداوار ہے، باقی ضمناً تو ایسے مذہبی مباحث پر خدا جانے
کتنی جگہ اظہار رائے ملیگا، جس میں اس ساری "ملائم و معتدل ارتیابیت" کی تردید ہوتی جاتی ہو کہ "ہم اپنی

[1] فہم انسانی، باب ۴، فصل ۱۔ [2] ایضاً باب ۱۲، فصل ۲، [3] اس بوالعجبی کا اگر پورا تماشا دیکھنا ہو تو سیرۃ النبی جلد سوم مطبوعہ دارالمصنفین کا مقدمہ دیکھنا چاہئے۔ [4] The Natural History of Religion.

تحقیقات کے دائرہ کو فقط انہی مباحث تک محدود رکھیں جو انسان کی تنگ او
محدود سمجھ کے مناسب ہیں"،

اس "تنگ اور محدود سمجھ" میں بھی کم از کم ایک بار اگر کوئی بات آئی تھی، تو وہ یہ کہ "سارا کارخانہ فطرت اپنے
ایک صاحب عقل خالق کی شہادت دے رہا ہے" اور کوئی عقلمند محقق سنجیدہ غور و فکر کے بعد ایک لمحہ بھی سچے دین و
مذہب کے ابتدائی اصول کے یقین سے اپنے کو روک نہیں سکتا"[1]

یا پھر اس "معقول اور معتدل ارتیابیت" کا صحیح نتیجہ یہ ہو سکتا تھا، جس پر "**فہم انسانی**" کا صحیفہ ختم ہوتا ہے،
کہ جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے، وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن انکی اصلی
و محکم بنیاد وحی و ایمان پر ہے"

مگر کہیں یہ اعلان بھی ہے کہ "مذہب کی باتیں بیماروں کے خواب کے سوا کچھ نہیں"[2] جس کو بیانات بالا کیساتھ
ملا کر پڑھنے کے بعد شاید "سنجیدہ غور و فکر" اور "وحی و ایمان" دونوں سے محرومی کا اعلان کیا جا سکتا ہو، ورنہ کوئی بتلا
کہ ہم "بتلائیں کیا"،

بات یہ ہے کہ جب ایک طرف ارتیابیت کے بھنور میں پھنسکر انسان کی عقل بالکل ڈوب چکی ہو، اور دوسری
طرف وحی و ایمان کا سہارا بھی نہ ہو، تو دل اور دماغ کے اس دہرے بیمار کو مذہب کی باتیں بیماروں کے خواب کے
سوا نظر ہی کیا آسکتی ہیں، جو بیمار اپنے کو بیمار نہ جانتا ہو، وہ ضرور تندرستوں کو بیمار جانیگا،

آخر میں اصل نتیجہ پر پھر ایک نگاہ ڈال لو، جدید فلسفہ پہلے ہی قدم پر جس سوچ میں پڑ گیا تھا، کہ "میں سوچتا
ہوں، اسلئے میں ہوں" اس کے بعد عقل اور فلسفے، منطق اور استدلال کی طاقت سے یہ بالکل باہر ہو گیا، کہ وہ پھر
اسی سوچ سے ایک قدم بھی باہر نکال سکے، لاک نے بہت زور لگایا، کہ کم از کم "صفات اولیہ" کو باہر لا سکے، مگر

[1] دیکھو ماڈرن تھنکرس ص ۹۲، جس کے مصنف (Edger Asinger) پروفیسر فلسفہ کو ہیوم کے ان تناقضات کا حل مشکل معلوم ہوتا ہے، [2] تاریخ فلسفہ از ویبر ص ۴۲۳،

تم نے دیکھا کہ خود لاک ہی کی دلیل سے برکلے نے ان کو "بھی صفات ثانیہ" کی طرح اندر ہی پہونچا دیا، اور آگے چل کر
تاریخِ فلسفہ بس "ایک گردش پرکار" ہو کر رہ گئی، کہ ہر قدم ہر پھر کر اسی سوچ کے دائرہ میں پڑتا رہا،
برکلے کی بے پناہ منطق نے اسی دائرہ کے اندر بند کر کے مادہ کا نام لینے تک کی گنجایش نہ چھوڑی، اور
بعینہٖ اسی منطق سے جو دوسرا نتیجہ نکل سکتا تھا، نکالدیا، کہ اگر مادہ نہیں تو روح بھی نہیں، اس کے بعد رہ کیا گیا،
خالی سوچ یا مجرد احساسات و خیالات جو نہ کسی باہر کے مادی جوہر کے آفریدہ ہیں، اور نہ کسی اندر کے روحانی جو
میں قائم، گویا یونہی آپ ہی آپ ٹنگے ہیں، "میں سوچتا ہوں" کا میں بھی غائب اور نرا سوچ ہی سوچ فلسفہ کے ہا
میں رہ گیا،

نیز اس "سوچ" کے مختلف احساسات، خیالات اور ادراکات وغیرہ میں باہم جو ایک ربط اور وابستگی نظر
تھی، جسکو علت و معلول کہا جاتا تھا، یعنی ایک کا دوسرے پر لازماً موقوف اور اس کا محتاج ہونا، ہیوم کا سب
بڑا کارنامہ یہی ہو کہ اس علیت و معلولیت، لزوم و احتیاج کے واقعے کو بھی ایک طرح کے "سوچ" (ذہنی
ہی میں تبدیل کر دیا،

اس طرح ڈیکارٹ سے صرف ہیوم تک ہی آتے آتے فلسفیانہ علم و یقین کے پاس نہ مادہ رہا، نہ
نہ جسم نہ نفس، نہ میں نہ تو، نہ زمانہ نہ غیری، نہ علت نہ معلول، نہ قوت نہ خاصیت، نہ لزوم نہ وجوب، نہ اندر نہ با
دے کر صرف شعور یا احوالِ شعور، خیالات اور محض خیالات، جو نہ کسی شے کے ہیں اور نہ کسی شخص کے یعنی وہی نرا سوچ

اب اس سے بڑھکر انسانی عقل کی کمزوری اور کورچشمی کا تماشا کیا دیکھئے، کہ دیکھنے کے لئے جتنا زیادہ
لگاتے ہیں، اتنا ہی زیادہ اور اندھے ہوتے جاتے ہیں،!!

شاید اسی طرح کی عقل آزمائی کے بعد کچھ "ہوشیار" دیوانے بنجاتے ہیں،

آزمودم عقلِ دور اندیش را، بعد ازاں دیوانہ کردم خویش را،

اسلامی نظامِ تعلیم

از مولینا سید ریاست علی صاحب ندوی

(۲)

اخلاق و سیرت کی تربیت

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ طالب علموں میں نیک سیرت اور عمدہ اخلاق پیدا کئے جائیں، چنانچہ مشہور علماء کے ایسے بہت سے اقوال ہیں، جن میں طلبہ کو بلند اخلاق کے حصول کی تلقین کی گئی ہے، ابومرزوق حبیب بن شہید متوفی ۱۰۵ھ اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں:-

"بیٹا (حصولِ علم کیساتھ) عالموں اور فقیہوں کی صحبت اختیار کرو، ان سے تعلیم حاصل کرو، تہذیب و شائستگی سیکھو، یہ میرے نزدیک زیادہ باتیں بنانے سے بہتر ہے"،

ابن سیرین فرماتے ہیں:-

لوگ جیسے علم حاصل کرتے تھے، ویسے ہی سیرت اور اخلاق بھی حاصل کرتے تھے"،

سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے:-

آنحضرت صلعم سب سے بڑی ترازو ہیں، چیزیں آپ ہی کے خلق اور سیرت پر تولی جائیں، جو چیزیں آپ کے مطابق نکلیں، وہ حق ہیں، اور جو آپ سے مخالف ہوں وہ باطل ہیں،

بعض بزرگوں کا قول ہو کہ

"تہذیب اور حسن ادب کا ایک باب پڑھنا علم کے ستر بابوں کے پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے"،

حضرت مخلد بن حسین ابن مبارک سے فرماتے ہیں:-

"ہم لوگ حدیثیں زیادہ حاصل کرنیکے بجائے حسنِ ادب کے زیادہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں"،[1]

[1] تذکرۃ السامع از ص ۲ تا ۱۴،

طلبہ کو اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تلقین

اہل علم و اساتذہ طالب علموں کو اسلام کی ان تعلیموں کے مطابق انھیں اپنا تعلیمی نصب العین مقرر کرنے کی ہدایت کرتے تھے، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اُسے استادوں کے فرائض میں شمار کیا ہے، کہ وہ طلبہ کو اپنے قول و عمل سے حسن نیت اور اخلاص عمل اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہیں، انھیں علم کی فضیلتیں بتائیں، اور اچھے مستقبل کی امید دلائیں، اور ان کے سامنے ان کے علم حاصل کرنے کا مقصد بیان کریں:

"وہ اپنی تعلیم اور تہذیب کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنا، علم کی اشاعت کرنا، شریعت کو قائم کرنا، حق بات زبان سے نکالنا، اور ناحق باتوں کو روکنا قرار دیں،..... (ورنہ) اگر نیک نیتی سے علم حاصل نہیں کیا گیا، تو اس علم سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں، کیونکہ حسنِ نیت ہی سے علم میں برکت حاصل ہونے کی امید کیجاتی ہے"

پھر دوسرے موقع پر طالب علموں سے کہتے ہیں کہ

"طلبہ کو چاہئے کہ وہ اپنے دل کو ہر قسم کی کھوٹ کپٹ، عداوت، کینہ، بدخلقی، اور بدعقیدگی سے پاک رکھیں، تاکہ اس میں علم کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، اس کی باریکیاں دل میں اتر سکیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا علم باطن کی نماز اور دل کی عبادت ہے، اس لئے جس طرح ظاہر کی عبادت، طہارت کے بغیر قبول نہیں اسیطرح باطنی عبادت بھی دل کی پاکی کے بغیر درست نہ ہوگی، حدیث میں آیا ہے، کہ "جسم میں ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہے، تو جسم بھی تندرست ہے، اور اگر اس میں خرابی آئی، تو سارا جسم ہی خراب ہو گیا، آگاہ رہو، کہ وہ دل ہے"

(بخاری کتاب الایمان جلد ۱ ص ۱۳)

سہل کہتے ہیں "قلب میں اس وقت تک روشنی نہیں پہونچ سکتی جب تک اس میں کوئی ایسی چیز موجود ہو جو خدا کو پسند نہیں ہے"

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ طالب علموں کے حُسن نیت اور اخلاص کے متعلق لکھتے ہیں:-

"پھر طالب علم کے لئے علم کی طلب میں دوسری شرط اسکی نیت کا خالص ہونا ہے، اس سے یقین رکھنا چاہئے، کہ علم کے حاصل کرنے کا مقصد خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کی جستجو اس کے حکموں پر عمل، شریعت کو زندہ، دل کو روشن اور باطن کو اجاگر کرنا ہے"[۱]

اسی طرح زرنوجی کہتے ہیں:-

"طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحصیل علم سے رضائے الٰہی، اور دار آخرت کی طلب جہل کے ازالہ احیائے دین، اور ابقائے اسلام کی نیت رکھے"[۲]

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:-

"میں نے اپنی نیت سے زیادہ کسی دوسری چیز کی نگرانی نہیں کی، کہ علم کی تحصیل کی غرض میں دنیاوی اغراض جاہ و منزلت کی خواہش، دولت و ثروت کی ہوس، ہمعصروں اور دوستوں میں سربلندی کی تمنا لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کا خیال شامل نہ ہو جائے، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو عمدہ چیز کے بدلہ میں معمولی چیز ملیجائیگی"

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

"لوگو! اپنے علم سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حاصل کرنے کی نیت رکھو، میں جب کبھی کسی مجلس میں اس نیت سے بیٹھا کہ خاکسار اور متواضع رہونگا، تو ہمیشہ اس مجلس سے سربلند ہو کر اٹھا، اور جب کبھی میری نیت میں فتور آیا، اور ہمچشموں میں سربلند ہونے کا تصور دل میں آیا تو مجھے اس مجلس سے رسوا ہو کر اٹھنا پڑا، علم بھی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے"[۳]:-

نصب العین کی بلندی سے نظر کی بلندی،

اسلام کے اس بلند تعلیمی نصب العین کا یہ اثر تھا کہ اس دور کے اہل علم

[۱] تذکرۃ السامع ص ۶۷، ۶۸، ۶۹، امام غزالی نے احیاء العلوم جلد ۱ کتاب العلم میں اسے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، [۲] تعلیم المتعلم ص ۱۴، [۳] تذکرۃ السامع ص ۶۹، ۷۰،

دور نے بڑی بلند نظر پائی تھی، اور اپنی زندگی بڑے استغنا اور قناعت سے گذارتے تھے، اور اپنے علم کی عزت خود کرتے تھے، وزیر جعفر برمکی عیسیٰ بن یونس مقری کے متعلق کہتا ہے، :-

"مین نے قاریوں میں عیسیٰ بن یونس کے مثل کسی کو نہین دیکھا، ان کے سامنے ایک لاکھ درہم پیش کئے گئے، لیکن انھون نے یہ کہکر واپس کر دیئے، کہ خدا کی قسم اہل علم یہ کہہ سکیں، کہ میں نے سنت کی اشاعت کرنے کی قیمت کھائی ہے"،

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر مامون نے دس ہزار ان کی خدمت میں پیش کئے، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا،[1]

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے، کہ

"مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا، لیکن جب مین نے ابو جعفر (المنصور متوفی ۱۵۸ھ) سے تھیلی لے لی، تو وُہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے مسامحت پر عفو چاہتے ہین"،[2]

بعض شبہات کا ازالہ اور اسلام میں دیگر علوم کی اہمیت

اسلام کے اس تعلیمی نصب العین سے یہ شبہہ نہ ہو، کہ اسلام نے دوسرے دنیاوی علوم جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی، اور جن پر انسانی معاشرت، عمرانی ضرورت اور جسمانی آسایش کا مدار ہے، ان کی کوئی اہمیت نہیں دی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک اپنے خطبہ میں کہتے ہین، کہ

"آٹھوین صدی (دوسری صدی ہجری) میں اسلامی دنیا کے ایک سربرآوردہ عالم کا ذکر ہے، کہ اس نے بڑے تذبذب کیساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ فقہ کے علاوہ جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے، اور جو روحانی صحت کا باعث ہو، طب بھی علم کی ایک شاخ ہے جس سے جسمانی صحت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے، ان کے علاوہ اس نے باقی سب علوم کو تفنن طبع کا سامان قرار دیا"،

[1] تذکرة الحفاظ جلد ا ص ۲۵۰ [2] تذکرة الحفاظ،

شبہہ اسلام کے اسی بلند نصب العین کی غلط تاویل سے پیدا ہوا ہے، درحقیقت اسلام کے اس بلند نصب العین کا تعلق علم اور تعلیم کے مقصدِ اعلیٰ سے ہے، ورنہ اس نے نہ صرف ہمیں دنیاوی، عمرانی، اجتماعی، اور معاشرتی ضرورتوں کے لئے دوسرے علموں کے حاصل کرنے کی اجازت دی، بلکہ بعض موقعوں پر ہمت افزائی کی ہے، اور ان کے تعلیم و تعلم میں دینی حیثیت سے کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی ہے، ارشاد نبوی ہے:

أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ، تم اپنے دنیاوی امور کے زیادہ جاننے والے ہو

وعید کی ان حدیثوں میں بھی جن میں علم کی تحصیل میں دنیاوی غرض کے وابستہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے، یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ مومن کی ہر حرکت و جنبش خداوند تعالیٰ کی خوشنودی ہی کے ماتحت رکھی گئی ہے، اور ہر کام میں اصل مدار انسانون کی نیتوں پر رکھا گیا ہے، اسلئے اگر کسی دنیوی سے دنیوی علم کی تحصیل بھی مثلاً مخلوقِ خدا کو فائدہ اور شہر اور وطن کے لوگون کو آرام پہنچانے اور اہل و عیال کی پرورش کرنے کے لئے اس نیت سے کی جائے، کہ ان کے حقوق ادا کرکے اور انھیں فائدہ پہونچا کر حکم خداوندی بجا لانے کی توفیق حاصل ہو گی، تو بارگاہِ الٰہی سے اُسے مقبولیت کی سند عطا ہو گی، اور وہ آخرت میں اجر پانے کا مستحق ہو گا، احادیث میں اس مفہوم کی مختلف روایتیں ہین، مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے بچہ کے منہ میں ایک لقمہ بھی اس نیت سے ڈالا کہ حکم خداوندی پورا ہو گا، تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کا اجر اسے عطا فرمائے گا، ایک حدیث میں ہے کہ "بہت سے ایسے عمل جو دنیاوی معلوم ہوتے ہیں، وہ حُسنِ نیت سے اُخروی اعمال بن جاتے ہیں، اور بہت سے عمل جو دینی نظر آتے ہیں، وہ نیت کی برائی سے دنیاوی بن جاتے ہیں"،

علاوہ ازین وعید کی ان حدیثوں میں سے ابوداؤد میں جو حدیث مروی ہے اس کے متن کے الفاظ یہ ہیں، :-

مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی

وجہ اللہ تعالیٰ لایتعلمہ الا — رضی حاصل کیجاتی ہے، اسلئے حاصل کیا کرائی
یصیب بہ غرضا من الدنیا لم — کوئی دنیوی غرض حاصل کرے، تو وہ قیامت
یجد عرف الجنۃ یوم القیامۃ — کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا،

اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے، کہ یہ تمام وعیدیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو اشرف علوم یعنی علم دین کی تحصیل میں مصروف ہوں، اور اس سے ان کی کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہو، اسلئے معلوم ہوا کہ صرف علم دین کا کسی دنیاوی غرض سے حاصل کرنا اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے، ورنہ جہاں تک دوسرے دنیاوی علوم کا تعلق ہے بعض اوقات علما نے ان کی تحصیل مسلمانوں پر فرض کفایہ کے طور پر عائد کی ہے امام غزالی نے احیاء العلوم میں یہ نکات تفصیل سے دکھائے ہیں، چنانچہ حدیث نبوی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم اور اطلبوا العلم ولو کان بالصین پیش کر کے جس علم کی تحصیل ہر مسلم پر فرض ہے، اسکو دکھا کر "اس علم کا بیان جس کی تحصیل فرض کفایہ ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں:-

"علوم کی اولاً دو قسمیں ہیں، (۱) علوم شرعیہ و (۲) علوم غیر شرعیہ،

علوم شرعیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو انبیائے کرام علیہم الصلوات سے براہ راست حاصل ہوتے ہیں، ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہوسکتی، جیسے عقل کے ذریعہ علم حساب سیکھا جاتا ہے، نہ وہ تجربہ سے حاصل ہوسکتے ہیں، جیسے علم طب کی تدوین ہوتی ہے، اور نہ محض سننے سے انکا حاصل کرنا ممکن ہے، جیسے علم لغت حاصل کیا جاتا ہے،

انکے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں، ان میں بعض پسندیدہ ہیں، اور بعض ناپسندیدہ، اور بعض ایسے جو صرف درجۂ مباح رکھتے ہیں،

۱- علوم پسندیدہ وہ ہیں جن سے دنیاوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں، جیسے علم طب اور حساب وغیرہ،

پھر ان علوم پسندیدہ میں اپنے درجوں کے لحاظ سے بعض ایسے ہیں جنکا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، بعض ایسے ہیں جنھیں

حاصل کرنا افضل ہے اور بعض ایسے ہیں جنکو حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی تحصیل فرض نہیں ہے،

پھر ان میں سے فرض کفایہ ہر وہ علم ہے جس سے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں بے پروا نہیں ہوسکتے، جیسے علم طب ہے، کہ اس کی تحصیل صحت کے باقی رکھنے کے لئے لازمی ہے، یا علم حساب ہے کہ مختلف معاملوں وصیتوں اور ترکہ کی تقسیم میں اسکی ضرورت ہوتی ہے، اگر کوئی شہر ان علوم کے جاننے والوں سے خالی ہو جائے، تو شہر والوں کو دقت پیش آئے گی اور جب کوئی ایک شخص بھی ان کا جاننے والا ان کے درمیان پیدا ہو جائے تو اس کے ذریعہ سے شہر کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، اس لئے یہ فرض اس کی موجودگی میں دوسروں کو ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، اسی طرح مختلف پیشے کاشتکاری، باغبانی، پارچہ بافی، سیاسی حجامت اور خیاطی وغیرہ ہیں، کہ اگر ان میں سے کسی پیشہ والے سے کوئی شہر خالی ہو جائے، تو زحمت پیش آئے، اور بعض پیشہ والوں کی عدم موجودگی میں ہلاکت تک کی نوبت آجائے، پس جس نے بیماری اتاری، اس نے دوا بھی بتائی، اور ان کے استعمال کے طریقے بتائے، اور ان کے مہیا کرنے کے اسباب پیدا کئے، اس لئے ان پیشوں کو چھوڑنا جائز نہ ہوگا

اور بعض علوم جن کا حاصل کرنا اگرچہ فرض نہیں، مگر افضل ہے، وہ جیسے علم حساب، طب میں باریکیاں پیدا کرنا ہو، کہ انسان ان سے مستغنی ہوسکتا ہے لیکن ان کی تحصیل سے فائدہ پہونچنے کے پہلوؤں میں اضافہ ہوتا ہے،

ناپسندیدہ علوم میں سحر، شعبدہ بازی، اور نظر بندی وغیرہ ہیں، اور علم مباح میں جیسے ایسے اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا ہے"[1]

پھر امام غزالی نے بھی ایک دوسرے موقع پر "ہی علم" کے مصداق میں مختلف علموں اور پیشوں کو داخل

[1] احیاء العلوم جلد ۱،

کیا ہے ان کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے، لکھتے ہیں:-

"جب علم تمام امور میں افضل ہو تو اس کا حاصل کرنا افضل چیز کا حاصل کرنا ہے، اور اس کی تعلیم دینا افضل چیز کا مہیا کرنا ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے، کہ انسان کی پیدائش کے مقاصد دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہیں، کیونکہ دین کا نظام جبتک دنیاوی نظام قائم نہ ہو، قائم نہیں ہوسکتا، اور امر دنیاوی کا انتظام انسانوں کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے، اور انسانی پیشے تین قسم کے ہین،

ایسے پیشے جو عالم کے قیام کے لئے بنیاد کے طور پر ہین، اور وہ چار ہیں، زراعت انسان کی غذا کیلئے، پارچہ بافی تن پوشی کے لئے، تعمیر سکونت کی جگہ کے لئے اور سیاست خاندان اور ملک کے انتظام اور معیشت کے اسباب کے مہیا کرنے اور اسکی حفاظت کرنے کے لئے،

۲- دوسرے وہ پیشے جو ان چاروں پیشوں کے لئے آلات اور وسیلے مہیا کرین، جیسے لوہاری اور ندافی (دھنائی) وغیرہ،

۳- تیسرے وہ پیشے ہیں، جو پہلی قسم کے پیشوں کو مدد پہونچاتے ہیں، جیسے کھانا پکانے، اور سینے پرونے وغیرہ کے پیشے،

ان سب پیشوں میں پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے بھی سب سے افضل سیاست کا پیشہ ہے، جس سے نظم اور ضبط کا وجود عمل میں آتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی اصلاح کیجاتی ہے، اور انھیں حق کی راہ دکھائی جاتی ہے،

پیشہ سیاست کے چار درجے قرار پا سکتے ہیں،

۱- پہلے درجہ میں انبیائے کرام کی سیاست ہے، جو وہ اپنے پیغاموں سے خلق کی رہبری فرماتے ہین،

۲- دوسرا درجہ خلفاء اور سلاطین کو حاصل ہے، ان کے احکام عوام وخواص پر نظم وانتظام کے لئے جاری ہوتے ہیں، لیکن ان کی حکومت ظاہر پر ہوتی ہے باطن پر نہیں،

۳- تیسرے علمائے کرام ہین، یہ انبیائے کرام کے وارث ہین، ان کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے، اور یہ باطن کی اصلاح کرتے ہین،

۴- چوتھے واعظ ہین جو صرف عوام کی اصلاح کرتے ہیں،

پس ان پیشوں میں سب سے بڑھ کر پیشہ نبوت کے بعد علم کا فائدہ پہونچانا اور لوگوں کو تہذیب اخلاق سکھانا ہے، اور یہی فن تعلیم کا حقیقی مقصود ہے"[1]

اس کے ساتھ اسلامی نقطہ نظر سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کے لئے یہ بھی جائز نہ تھا کہ وہ اس علم کی فضیلت پر ناز کرکے دوسرے غیر شرعی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھیں، کیونکہ دنیاوی زندگی میں ان علوم کی ضرورتین مسلم تھیں، امام غزالی نے اس بحث پر اس لحاظ سے بھی گفتگو کی ہے، اور نتیجہ کے طور پر دکھایا ہے، کہ علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدوں سے دیجاسکتی ہے، جو جہاد کے میدان میں اپنا تیر چلا کر دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں، اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے اس دستہ کی دیجائیگی، جو سرحدی قلعون پر سرحد کی حفاظت کیلئے متعین ہوتا ہے،[2]

علم کی تعلیم وتحصیل انسانی فطرت میں طبعی ہے،

دوسری طرف علمائے اسلام مین سے ابن خلدون نے تعلیم وتحصیل کے فن کو تمدنی زندگی میں انسانی طبیعت کے لئے فطری قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"انسان تمام حیوانون سے اپنی حیوانیت میں حس حرکت اور غذا کے لحاظ سے مشارکت رکھتا ہے، اسے حیوانون سے جو امتیاز حاصل ہے، وہ اس کی قوت فکر کی وجہ سے ہے، اس کے ذریعہ سے وہ اپنی معاش کی تحصیل اور اپنے ابنائے جنس سے اس کے حصول میں تعاون کرتا ہے، اور اس تعاون

[1] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۸ و ۹، [2] رر جلد ۱ ص ۴۴،

کے مہیا کرنے کے لئے اجتماعی ہیئت اختیار کرتا ہے،
وہ اسی قوتِ فکر سے ان پیغاموں کو قبول کرتا ہے، جو انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں، اور ان پر عمل کرتا ہے، اور اپنی آخرت کی بھلائی کے وسیلے اختیار کرتا ہے، وہ ان تمام معاملات میں ہر وقت غور و فکر سے کام لیتا رہتا ہے، پل بھر بھی اس سے غافل نہیں ہوتا، اور اسی غور و فکر کے ذریعہ سے علوم پیدا ہوتے ہیں، وہ اس فکر کے ذریعہ اُن ادراکات کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اسے حاصل نہیں رہتے، اس لئے وہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرتا ہے، جو اس سے پہلے علم حاصل کر چکے ہوتے ہیں، یا جن لوگوں کو اس کی معرفت زیادہ حاصل رہتی ہے، یا ان انبیاؑ کی تعلیمات میں ڈھونڈھتا ہے، جو پیشتر گذر چکے ہیں، اور ان سے انکی تعلیمات کی تلقین حاصل کرتا ہے، اور ان کے حاصل کرنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے؛

پھر اس کی فکر و نظر ایک ایک کر کے حقائق تک پہنچتی ہے، اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے، اسکا مطالعہ کرتا ہے، اور اس کی مشق مسلسل جاری رکھتا ہے، یہاں تک کہ اس حقیقت کے عوارض کے الحاق سے اسے ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے، اسوقت اس حقیقت کو جو چیز پیش آتی ہے، اسکے متعلق اس کا ایک مخصوص علم بن جاتا ہے، اور آیندہ نسل اس کے حاصل کرنے کی مشتاق ہوتی ہے، اور لوگ اسکے جاننے والوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور اسی سے فنِ تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم و تعلیم انسانی فطرت کے لئے طبعی ہے؛[1]

پھر ابنِ خلدون نے امام غزالی سے زیادہ واضح طریقہ سے علم و تعلیم کو منجملہ دنیاوی پیشوں کے ایک پیشہ قرار دیا ہے، اور اس نے اسے مختلف وقیع دلیلوں سے ثابت کیا ہے، اس لئے یہ سمجھنا کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین میں صرف مذہبی تعلیم داخل رہی ہے، صحیح نہیں ہے، بلکہ علمائے اسلام نے جملہ علوم کو عقلی و نقلی

[1] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۴۰۰، ۴۱۲، ۴۱۵، ۴۱۲، ۴۲۴،

دو بڑی قسموں میں تقسیم کر کے قسم اول یعنی عقلی علوم کی تحصیل انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری قرار دی ہے اور نقلی علوم کو ربانی پیغام کی تحصیل، دین و مذہب کی واقفیت اور آخرت کی بھلائی کے لئے حاصل کرنا فرض ٹھہرایا ہے، جیسا کہ امام غزالی کا بیان اوپر گذر چکا، اسی طرح ابن خلدون لکھتا ہے؛-

"جن علوم پر انسان غور کرتا ہے، اور جن کی تحصیل و تعلیم شہروں میں عام طور پر کیجا سکتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک انسان کے لئے طبعی ہے، جسے وہ اپنی قوتِ فکر سے حاصل کرتا ہے، اور دوسری نقلی ہے جسے اسکے وضع کرنے والے سے حاصل کیا جاتا ہے،

قسم اول علوم حکمیہ فلسفیہ ہیں، یہ وہ علوم ہیں جن سے انسان اپنے غور و فکر کی طبیعت کے ذریعہ واقف ہوتا ہے اور اپنے بشری ادراک کے ذریعہ ان کے مسائل اور براہین تک پہونچتا ہے، یہاں تک کہ اسکی نظر وسیع ہو جاتی ہے، اور وہ اس حیثیت سے کہ وہ صاحبِ غور و فکر انسان ہے، اس کے صواب و خطا کی تمیز کرتا ہے،

اور دوسرے وہ وضع کئے ہوئے نقلی علوم ہیں، جو واضع شرعی کی خبر کی بنیاد پر قائم ہیں، اور ان میں عقل کو دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اس کے فروعی مسائل کو اس کے اصول سے عقل و قیاس کے ذریعہ سے ملانے کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ بعد میں پیش آنے والے جزئیات نقل کلی کے ماتحت اپنی وضع کے وقت درج نہیں کئے جا سکتے، اسلئے قیاسی صورت کے الحاق کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ قیاس بھی اصل میں حکم کے ثبوت کیساتھ خبر ہی سے نکلتا ہے، اس لحاظ سے یہ قیاس بھی نقل قرار پائے گا، اور ان تمام نقلی علوم کی شرعی بنیاد کتاب و سنت ہی، جو ہمارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشروع کیا گیا ہے۔"[1]

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۶، ۴۳۵

(۲)

اسلامی نظامِ تعلیم کے تین دور

زمانہ کے اعتبار سے اسلامی نظامِ تعلیم کے تین دور قائم کئے جاسکتے ہیں :-

پہلا دور، عہدِ رسالت سے دولتِ اُمویہ کے ابتدائی زمانہ تک،

دوسرا دور عہدِ اموی سے چوتھی صدی ہجری تک،

تیسرا دور پانچویں صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک،

ان تینوں دوروں کی امتیازی خصوصیتیں حسبِ ذیل ہیں :-

پہلا دور قرآن مجید جس طرح تمام اسلامی علوم وفنون کا سرچشمہ ہے، ویسے ہی مسلمانوں کے تعلیم وتعلم کی داستان کا آغاز بھی اسی کے نام سے ہوتا ہے، نزولِ قرآن کے ساتھ اس کی کتابت کی ضرورت پیش آئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ چند کاتبوں عبداللہ بن سعید بن عاص رضؓ کو مسلمانوں کو فنِ کتابت سکھانے کے لئے مقرر فرمایا، اور بعض صحابہ حضرت ابن مکتوم رضؓ وحضرت مصعب بن عمیر رضؓ مکہ کے قیام کے زمانہ میں باشندگان مدینہ کو قرآن مجید پڑھانے کے لئے مدینہ بھیجے گئے،[۱] پھر مدینہ منورہ پہونچ کر آپ نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر توجہ رکھی، اور نوشت وخواند دونوں سلسلے قائم رہے، غزوۂ بدر کے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا جانتے تھے، ان کا فدیہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھانا قرار پایا،[۲] اسی طرح مسجد نبوی میں اصحاب صفہ کا حلقۂ درس قائم کیا گیا جس میں ایک شخص قرآن مجید پڑھاتا تھا، اور حلقہ کے دوسرے حاضرین اسے توجہ سے سنتے تھے، پھر نئے مہاجرین جو دوسرے مقاموں سے آتے گئے، وہ درسِ قرآن کیلئے اسی حلقہ میں شریک کئے گئے،[۳]

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۸۴، وبخاری کتاب التفسیر آیۂ سبح اسم ربک الاعلیٰ [۲] جلد اص ۲۴۶ [۳] جلد ۳ صفحہ ۱۳۷،

اس حلقہ کے ماسوا ہر تعلیم یافتہ مسلمان ناخواندہ مسلمان کے لئے معلم تھا، عربوں کے جو وفد دور دور سے مدینہ منورہ آتے، وہ انصار کے مکانوں میں فروکش ہوتے تھے، جہاں انھیں کتاب وسنت کی تعلیم دیجاتی تھی، چنانچہ وفد عبدالقیس کا بیان ہے، کہ

"انصار ہمیں ہمارے پروردگار کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے تھے"[۱]

پھر فتوحات کے بعد جب نظامِ حکومت کی تشکیل ہوئی، اور عمال مقرر ہوکر ولایتوں میں بھیجے جانے لگے، تو آپ نے اُن کا مقصدِ سفر یہ بیان فرمایا، کہ

"(یہ بھیجے جاتے ہیں) تاکہ لوگوں کو قرآن اور اسلامی شریعت کی تعلیم دیں"[۲]

اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا، تو قرآن کی تعلیم کے لئے مستقل معلمین عمال کے ساتھ بھیجے گئے، جیسے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بصرہ کے عامل بنائے گئے تو حضرت عمران بن حصین رضؓ قرآن مجید وشریعتِ اسلامی کی تعلیم کے لئے ان کے ساتھ کئے گئے، اسی طریقہ سے شام کی فتح کے بعد مختلف شہروں میں عمال کے علاوہ قرآن کی تعلیم دینے والوں کا تقرر ہوا، حضرت عبادہ بن صامت رضؓ نے معلمِ قرآن کی حیثیت سے حمص میں قیام فرمایا، حضرت معاذ بن جبل رضؓ فلسطین روانہ ہوئے اور حضرت ابو دردا رضؓ نے دمشق میں اقامت اختیار فرمائی،[۳] ان معلمین نے نو مفتوح شہروں میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے مکاتب قائم کئے، اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا، لوگ جوق جوق علم کی تحصیل کے لئے ان کے درس میں شریک ہونے لگے، حضرت ابو درداؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے، کہ جب وہ دمشق کی جامع مسجد میں درس کے لئے بیٹھتے تھے، تو طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا، کہ گویا کسی بادشاہ کے استقبال کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں،[۴] صحابہ جہاں بیٹھتے، محفل کی شمع بن جاتے، اور لوگ علم حاصل کرنے کے لئے پروانوں کی طرح ان پر گرتے، ابو ادریس خولانی بیان

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۲، [۲] استیعاب تذکرہ حضرت معاذ بن جبلؓ عامل یمن [۳] اسد الغابہ ترجمہ حضرت عبادہ بن صامت رضؓ، [۴] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حضرت ابو دردا رضؓ

کرتے ہیں، کہ وہ ایک مرتبہ حمص کی مسجد میں گئے، تو ۳۲ صحابہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، وہ یکے بعد دیگرے اپنی روایتیں سناتے رہے، اور لوگ ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے،[۱]

صحابۂ کرام نے علم حدیث کی اشاعت کی خدمت مستقل طور پر انجام دی، جو جس شہر میں قیام پذیر تھا اس نے وہاں کی مسجد میں روایت و سماع کے لئے حلقہ قائم کر لیا تھا، مثلاً حضرت جابر بن عبد اللہ[رض] مسجد نبوی میں مستقل طور پر درس دیتے تھے،[۲] حضرت ابو درداء[رض] دمشق کی مسجد میں بیٹھتے تھے،[۳] حضرت حذیفہ بن اسحاق[رض] کوفہ کی مسجد میں درس کا سلسلہ قائم کئے تھے،[۴]

کتاب و سنت کی تعلیم و اشاعت کیساتھ جب مختلف نئی صورتوں اور ضرورتوں میں کتاب و سنت پر قیاس کرکے مسائل مستنبط کرنے کی ضرورت پڑی تو ایسے اہل علم متعین کئے گئے، جو اس خدمت کو اپنی ذہنی اور علمی بصیرت سے انجام دیں اور لوگوں کو مسائل کے استنباط کے طریقے بتائیں، چنانچہ مختلف صحابہ اس خدمت پر مامور ہوئے، اور ان کے ذریعہ علم فقہ کی اشاعت ہوئی، مثلاً حضرت عبد الرحمن بن قاسم[رض] شام میں،[۵] حضرت عبد اللہ بن معقل[۶] اور حضرت عمران بن حصین[رض] بصرہ میں،[۷] حضرت عبد اللہ بن مسعود[رض] مدائن میں،[۸] اور حضرت حبان ابن جبلہ[رض] مصر میں[۹] اس خدمت پر مامور تھے،

پہلے دور کے تعلیمی خصوصیات، | یہ نظام دولت امویہ کے عہد کے ابتدائی دنوں تک جاری رہا، اس دور کے تعلیمی خصوصیات اجمالاً حسب ذیل تھے،

۱۔ علم، قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں منحصر تھا، ان کے ماسوا کسی دوسرے علم کی اشاعت نہیں کی گئی،

---

۱ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۲۰، ۲ حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۰، ۳ تذکرۃ الحفاظ ۴ مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۰۳، ۵ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عبد الرحمن بن اصری، ۶ اسد الغابہ ترجمہ عبد اللہ بن معقل ۷ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عمران، ۸ یعقوبی جلد ۲ ص ۱۶۳، ۹ تہذیب التہذیب ترجمہ حبان،

۲۔ تعلیم کتابی نہ تھی، قولی اور سماعی تھی،

۳۔ تعلیم کیلئے کوئی معاوضہ لینا یا دینا ممنوع تھا، معلّمین کے لئے معیشت کے دوسرے ذریعے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایک مہاجر نے حضرت عبادہ بن صامت[رض] کو جن سے وہ قرآن پڑھتے تھے، ایک کمان ہدیہ میں بھیجی، تو آنحضرت صلعم نے اس کے لینے سے منع فرما دیا،[۱]

۴۔ استاذ، طالب علموں سے بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے، جسکی بہ کثرت مثالیں ہیں،

۵۔ مسجدیں، تعلیم گاہ کے طور پر استعمال کیجاتی تھیں،

۶۔ علم حدیث کے چرچے سے علم کی تحصیل کے لئے سفر کرنے کا رواج ہوا، خود صحابۂ کرام بھی ایک ایک حدیث کے تحقیق کے لئے ایک دوسرے کے پاس ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے تھے، ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے کوئی بات بیان فرمائی تھی، اس موقع پر حضرت عقبہ بن عامر[رض] اور حضرت سائب بن مخلد حاضر تھے، حضرت سائب[رض] کو اس حدیث کے متعلق کچھ شبہہ ہوگیا، تو انھوں نے صرف اس شبہہ کو دور کرنے کے لئے مصر کا سفر کیا، اور وہاں پہنچ کر حضرت عقبہ[رض] سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا،[۲]

۷۔ علمی سفر کے متعلق یہاں تک احتیاط برتی جاتی تھی کہ اسے خالص تحصیل علم کے لئے ہونا چاہئے تھا، اگر اس میں کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہو جاتی، یا کسی شہر میں کوئی پہونچتا، اور ضمنی طور پر کچھ علم حاصل کرنا چاہتا، تو اسے مایوس ہونا پڑتا تھا، ایک مرتبہ ایک شخص حضرت ابو درداء[رض] کی خدمت میں مدینہ سے کسی حدیث کے متعلق دریافت کرنے کے لئے آیا، انھوں نے پہلے اس سے یہ اطمینان کر لیا، کہ یہ کسی دنیاوی غرض جیسے تجارت وغیرہ کے لئے نہیں آیا ہے، اسکے بعد اس سے حدیث بیان کی،[۳]

دوسرا دور، | دوسرے دور کا آغاز دولت امویہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کے زمانہ سے ہوتا ہے، علم کی اشاعت میں ان کے عظیم الشان کارنامے ہیں، انہی نے سب سے پہلے حدیثوں کے منتشر سرمایہ کو یکجا کرنے کیلئے

---

۱ ابو داؤد کتاب البیوع باب فی کسب العلم، ۲ حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۸۶، ۳ مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸،

صوبہ کے والیوں اور شہروں کے عاملوں کے نام فرمان بھیجے، کہ

"احادیث نبویہ کی تلاش کر کے انھیں لکھ لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف ہے، اور صرف رسول اللہ صلعم کی حدیث قبول کیجائے"[1]

چنانچہ اس فرمان کے بموجب احادیث کا قیمتی سرمایہ جمع ہو گیا، سعد بن ابراہیم سے روایت ہے کہ

"ہم کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا، تو ہم نے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھ لیں اور انھوں نے ان کا ایک ایک مجموعہ اپنی حکومت کے تمام حدود میں روانہ فرمایا"[2]

حدیثوں کے جمع کرنے کا مقصد صرف فن حدیث کی تعلیم و اشاعت تھا، چنانچہ اسی فرمان میں آگے چل کر ہے:-

"علماء کو چاہئے کہ علم کی اشاعت عام طور پر کریں اور تعلیم کے لئے درس کے حلقوں میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں، کیونکہ علم صرف اسی وقت ضائع ہوتا ہے، جب وہ راز بن جاتا ہے"

ایک دوسرے فرمان میں لکھا:-

"اہل علم کو حکم دو کہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں، کیونکہ حدیثیں فنا ہو رہی ہیں"[3]

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے نظام تعلیم میں ایک دوسری تبدیلی یہ کی، کہ پڑھانے والوں اور بعض اوقات پڑھنے والوں کو معاش کی فکر سے آزاد کر کے ان کے لئے مستقل وظیفے جاری کرنے کی ابتدا کی، چنانچہ انھوں نے والیوں کو لکھ بھیجا، کہ

"جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے کو فقہ کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو بیت المال سے سو سو دینار دو، تاکہ وہ لوگ موجودہ حالت میں اس سے مدد حاصل کریں"[4]

[1] بخاری کتاب العلم جلد ا ص ۲۰، و فتح الباری جلد ا ص ۱۷۴، [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸، [3] سیرۃ عمر بن عبدالعزیز (ابن جوزی)، [4] ص ۵۵،

اسی طرح اس عہد میں نادار طلبہ کے لئے بھی وظیفے جاری کئے گئے، جس کا تذکرہ ابن عبدالبر نے کیا ہے[1]

اس کے ماسوا اسی زمانہ سے شروع ہو کر دولت عباسیہ کے ابتدائی زمانہ تک میں مختلف شرعی، ادبی اور عقلی علوم کی تدوین ہوئی، اور غیر زبانوں کے علوم عربی میں منتقل کئے گئے، جس سے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا، چنانچہ اس عہد تک علوم قرآن، حدیث، فقہ، کلام، مغازی، سیر، تاریخ، ادب، نحو، شعر، طب، فلسفہ، منطق، ریاضیات، اور ہندسہ وغیرہ کی تدوین ہو چکی تھی،

دوسرے دور کے خصوصیات، ان حیثیتوں سے اس دور میں حسب ذیل تعلیمی خصوصیتوں کا اضافہ ہوا:-

۱- علوم و فنون کا سرمایہ سینوں سے نکل کر سفینوں میں آیا،

۲- تالیف، تصنیف اور ترجمہ کا سلسلہ قائم ہوا،

۳- کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا،

۴- اساتذہ اور طلبہ کے وظائف مقرر کئے گئے،

۵- مسجدوں میں تعلیم کے لئے درس کے مستقل حلقے قائم ہوئے،

۶- تعلیم عموماً مسجدوں ہی میں دی جاتی تھی، بلکہ اگر کسی نئی تعلیم گاہ کے قائم کرنے کی ضرورت ہوتی تو نئی مسجد ہی تعمیر کیجاتی تھی[2]

۷- بعض اسلامی ملکوں میں اہل علم کو اپنا تعلیمی شغل جاری رکھنے کے لئے جہاد کی خدمت سے بھی مستثنیٰ کیا گیا[3]

طریقہ تعلیم اس دور میں بھی وہی رہا، جو پہلے دور میں تھا، یعنی استاد زبانی تعلیم دیتا تھا، لیکن اس طریقہ میں پچھلے دور سے اس دور میں یہ اضافہ ہوا، کہ املا کا طریقہ جاری ہوا، استاذ جو کچھ درس دیتا شاگرد اسے لکھ لیتے یا استاذ خود لکھاتا جاتا، اور طلبہ لکھتے جاتے،

[1] جامع بیان العلم ص ۶۰، [2] معجم البلدان جلد ۵، ص ۳۷۵، [3] ذکر صقلیہ، ص ۳۷۶،

کتابون کی قرأت کراتے تھے،

۹۔ کتابون کے مصنفین بھی اپنی کتابون کی قرأت کراتے تھے،

۱۰۔ کتابون کی قرأت وسماع کی سند واجازت کے رواج کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی،[۱]

تیسرا دور

اس کے بعد اسلامی نظامِ تعلیم کا تیسرا دور شروع ہوا، اس مین تعلیمگاہون کے لئے مسجدون سے علیحدہ عمارتیں تعمیر کرکے عمارتین بنانے کا رواج ہوا، اگرچہ مسجدون مین بھی تعلیم کا سلسلہ قائم رہا، تاہم تعلیمگاہون کی علٰحدہ عمارتون سے اسلام کے تعلیمی نظام کی نئی تشکیل ہوئی، مدرسون کے لئے قواعد وضوابط بنائے گئے، طلبہ اور اساتذہ کے لئے اقامت گاہیں تیار ہوئین، ملک کے چیدہ اہل علم اپنے عہدہ کے فرق وامتیاز کیساتھ بیش قرار تنخواہون پر معلمی کے منصب پر سرفراز کئے گئے، اور طلبہ کے تعلیمی وظیفے پابندی سے جاری کئے گئے، ان کے لئے تعلیم کے سامان مہیا کئے گئے، ان کے قیام طعام اور لباس کا انتظام کیا گیا،

تیسرے دور کے خصوصیات،

ان حیثیتوں سے اس دور کے حسب ذیل نمایان خصوصیات قرار پا سکتے ہین،

۱۔ مدرسوں اور اقامت گاہوں کی تعمیر سے استادوں اور لڑکوں کی باہمی معاشرت کا آغاز ہوا،

۲۔ بڑے بڑے اوقاف کی بدولت علماء فراغ بالی سے اپنی خدمتیں انجام دیتے رہے، اور لڑکون کیلئے بھی تعلیمی سہولتین بہم پہونچین،

۳۔ مدرسوں کی تعمیر اور اوقاف کا قیام دینداری کی ایک علامت قرار پائی، اور نیک دل مسلمانون نے آخرت کی بھلائی کے لئے مدرسے اور دار الاقامے قائم کئے، نیز مدرسوں کی تعمیر اس دور کے تمدن میں دنیاوی اعزاز اور سربلندی کا ذریعہ سمجھی گئی، جس کی وجہ سے امراء واہل مناصب نے مدرسوں کی تعمیر میں بڑھ کر حصہ لیا،

[۱] یہ حصہ مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیہ از ص ۱۹ تا ص ۲۰، وتاریخ صقلیہ جلد دوم باب علوم وفنون از ص ۱۸۸ تا ۱۹۵ سے مستفاد ہے،

۴۔ اسلامی ملکون کی تعلیمی ترقی سے درس وتدریس کا پیشہ اس قدر معزز سمجھا جانے لگا، کہ اہل علم وزراء وامراء اپنی غیر معمولی مشغولیتون کے باوجود پڑھنے پڑھانے کے لئے بھی وقت نکالتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے امراء کے سوانح میں ان کے اہلِ علم کے درس کے حلقہ میں بلاتکلف شریک ہونے، اور خود درس کا حلقہ قائم کرکے لوگون کو پڑھانے کے واقعات ملتے ہیں،

۵۔ مختلف علوم وفنون کے لئے جداگانہ مدرسے قائم کئے گئے،

۶۔ طریقہ تعلیم کے لحاظ سے اس دور میں بھی املاء کا طریقہ جاری رہا، اور مصنفین اپنی کتابیں پڑھاتے تھے، لیکن اس دور میں کتابون کی قرات اور سماع کی سند اور اجازت کا طریقہ پہلے دور سے زیادہ اہتمام سے جاری ہوا، نیز اس دور میں ایک اضافہ یہ ہوا، کہ نصابِ تعلیم کی چیدہ کتابیں منتخب کی گئیں، اور ہر فن میں جو معیاری کتابیں نکلیں، انھیں درس کے نصاب میں داخل کیا گیا، ہر فن کے پڑھانے کے لئے مختصر رسالے تیار کئے گئے، لیکن پھر امتدادِ زمانہ سے نصابِ درس میں غیر ضروری کتابیں بھی داخل ہوگئیں، اور مختلف زمانون میں نصاب کی اصلاح کی کوششیں جاری رہین،[۱]

عہد اسلامی کے مختلف دورون میں اسلامی ملکوں میں تعلیم کے اہم مرکز

اسلامی نظامِ تعلیم کے ان مختلف دورون میں اسلامی ممالک کے مختلف شہر تعلیم کے اہم مرکز بنے رہے، جہان تعلیم کے سلسلہ کے تمام وسائل مہیا رہتے تھے، اور طلبہ دور دور سے پہونچ کر وہاں علم کی تحصیل کرتے تھے، یہ تعلیمی مرکز مختلف زمانون میں بدلتے رہتے ہیں، ابن خلدون نے اسکی یہ صحیح توجیہ کی ہے، کہ جس ملک کا تمدن جس قدر ترقی یافتہ رہا، اسی قدر وہان اعلیٰ تعلیم کے موقعے اور وسیلے پیدا ہوئے، اور پھر جس ملک کو تمدنی حیثیت سے زوال آیا، وہ اپنے تعلیمی مرکز کے امتیاز کو بھی کھو بیٹھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"اس کا سبب یہ ہے جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں، کہ علوم کی تعلیم بھی منجملہ پیشوں کے ایک پیشہ ہے"

[۱] ان مباحث کی تفصیل آگے آئیگی،

اور ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں، کہ پیشے شہروں ہی میں زیادہ ہوتے ہیں، اور شہروں کی تمدنی ترقی اور تنزل کے اعتبار سے ان میں بھی بیشی اور کمی ہوتی ہے، جس قدر تمدنی لطافتیں بڑھتی ہیں، ان پیشوں میں بھی باریکیاں اور ندرتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، کیونکہ یہ انسانی خاصہ ہے، کہ جب معاشی فراغ بالی حاصل ہوتی ہے، تو انسان کی زندگی میں مزید لطافت پیدا ہوتی ہے، اور ان میں علوم وصنائع سے شغف پیدا ہوتا ہے"

اسی اصول کے بموجب اسلامی عہد میں جو شہر تمدنی حیثیت سے کمال کے درجہ پر پہونچے، وہ تعلیم کے مرکز بھی قرار پائے، چنانچہ صحابہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ کو قدرۃً مدینۃ العلم کا لقب حاصل تھا، پھر کوفہ وبصرہ کو یہ امتیاز حاصل ہوا، اس کے بعد بغداد اور نیشاپور مشرق میں اور قیروان اور قرطبہ مغرب میں علم کے شہر قرار پائے اور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں انہی شہروں کو تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی، چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے:۔

"بغداد، قرطبہ، قیروان، بصرہ، اور کوفہ کو دیکھو کہ جب یہاں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تمدن پھیلا اور عمرانی ترقی کمال کے درجہ پر پہونچ گئی، تو یہاں علم کے سمندر جوش مارنے لگے، اور یہاں کے باشندے تعلیمی اصطلاحات اور مسائل کے استنباط میں تفننِ طبع دکھانے لگے، لیکن جب یہاں کے تمدن کو زوال آیا، اور یہاں کے باشندوں میں ابتری پیدا ہوئی، تو وہ بساط الٹ گئی، اور علم اور تعلیم مفقود ہو کر یہاں سے دوسرے شہروں میں منتقل ہو گیا"[1]

(باقی)

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۶،

علم الکلام

مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ اس کی عہد بعہد کی ترقیاں، اور علمائے متکلمین کے نظریات اور مسائل طبع چہارم، مطبوعہ معارف پریس ضخامت ۳۴۰ صفحے قیمت عہ

"منیجر"

عہدِ وسطیٰ کی تاریخِ مصر پر ایک نظر

از

جناب محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

مصر کے ملک سے مسلمانوں کو شروع ہی سے دلچسپی تھی، انھوں نے اس ملک کا نام قرآن میں پڑھا، اور یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے، حضرت یوسفؑ کی زندگی کے بہترین واقعات پیش آئے تھے، اور حضرت مریمؑ نے اسی ملک میں حضرت عیسیٰؑ کیساتھ ان کے بچپن میں پناہ لی تھی، یہ تاریخی واقعات ایسے تھے، جن سے مسلمان پوری طور پر واقف تھے، اور ان کی وجہ سے یہ ملک مسلمانوں کے لئے اجنبی نہیں تھا، اسلامی ملک ہونے کی حیثیت سے مصر کی تاریخ ۱۸ھ (۶۳۹ء) سے شروع ہوتی ہے، جب حضرت عمرو بن العاصؓ اسلامی فوجیں لیکر وہاں داخل ہوئے، اس وقت سے آج تک اس ملک کو تاریخِ اسلام میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے، مسلمانوں کے ابتدائی اور درمیانی دور میں یہ سرزمین اسلامی سلطنت کا غالباً سب سے زیادہ زرخیز علاقہ تھا، اسی پر قبضہ کی وجہ سے مسلمانوں نے بحیرہ روم کو اپنے قابو میں رکھا تھا، اس کے بعد کے زمانہ یعنی عہد فاطمیین میں جب بغداد پر زوال آیا، تو مصر اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بنا، سلاطینِ عثمانی کی فتح کے بعد اس ملک پر یورپ کی نوزائیدہ تہذیب کے اثرات پڑنے شروع ہوئے، ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۸ء) میں جب نپولین نے مصر پر ناکام حملہ کیا، اور آخر میں جب محمد علی پاشا کو بابِ عالی نے یہاں کا مستقل حاکم تسلیم کیا، تو یورپی تہذیب کے اثرات اور بھی زیادہ بڑھ گئے، اس لحاظ سے نپولین کا حملہ درحقیقت مصر کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا، اسی زمانہ سے تاریخِ مصر کا

نیا یعنی موجودہ دور شروع ہوا، اور اسی حملہ کی وجہ سے آج کل مصر تمام اسلامی ممالک میں علم و فضل کا مرکز بنا ہوا ہے، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ عالم اسلامی کا دل مکہ ہے، اور دماغ مصر، اسی دورِ وسطیٰ کی تاریخ جو ۱۸ھ (۶۳۹ء) سے شروع اور ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) پر ختم ہوتی ہے، ہم مختصراً اوراقِ آیندہ میں بیان کریں گے۔

مصر کے حکمراں خاندانوں کا نقشہ

سنہ ہجری	خاندان	سنہ عیسوی
۱۸ھ سے ۲۱ھ	حضرت عمرو بن عاصؓ کی فتحِ مصر	۶۳۹ء سے ۶۴۱ء
۲۱ھ ،، ۳۸ھ	خلفائے راشدین کے والیانِ مصر	۶۴۱ء ،، ۶۵۸ء
۳۸ھ ،، ۱۳۲ھ	خلفائے بنی امیہ کے والیانِ مصر	۶۵۸ء ،، ۷۵۰ء
۱۳۲ھ ،، ۲۵۴ھ	خلفائے عباسیہ کے والیانِ مصر	۷۵۰ء ،، ۸۶۸ء
۲۵۴ھ ،، ۲۹۲ھ	آلِ طولون	۸۶۸ء ،، ۹۰۵ء
۲۹۲ھ ،، ۳۲۳ھ	والیانِ خلفائے عباسیہ	۹۰۵ء ،، ۹۳۵ء
۳۲۳ھ ،، ۳۵۸ھ	اخشیدیہ	۹۳۵ء ،، ۹۶۹ء
۳۵۸ھ ،، ۵۶۷ھ	خلفائے فاطمیین	۹۶۹ء ،، ۱۱۷۱ء
۵۶۷ھ ،، ۶۴۸ھ	ایوبیین،	۱۱۷۱ء ،، ۱۲۵۰ء
۶۴۸ھ ،، ۷۹۲ھ	مملوک بحری	۱۲۵۰ء ،، ۱۳۹۰ء
۷۹۲ھ ،، ۹۲۳ھ	مملوک برجی	۱۳۹۰ء ،، ۱۵۱۷ء
۹۲۳ھ ،، ۱۲۱۳ھ	عثمانی والیانِ مصر اور مملوک	۱۵۱۷ء ،، ۱۷۹۸ء
۱۲۱۳ھ	نپولین کی مہم مصر اور دورِ جدید کا آغاز	۱۷۹۸ء

(۱)

شام اور عراق کی عظیم الشان فتوحات کے بعد جب مسلمانوں نے اپنے سیاسی حالات پر نظر ڈالی، تو

معلوم ہوا کہ ان فتوحات کو سنبھالنے کے لئے انھیں اور آگے بڑھنا چاہئے، اول تو یہ دونوں ممالک ہی بازنطینی سلطنت سے خطرناک طور پر قریب تھے، اگرچہ اس سلطنت نے اپنے بہترین ایشیائی صوبے کھو دئے تھے لیکن پھر بھی وہ مسلمانوں کے لئے خطرہ کا باعث تھی، تاریخِ عالم شاہد ہے کہ شام اور مصر کا سیاسی تعلق اس قدر گہرا ہے کہ شام کے حکمراں اسوقت تک اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے جب تک کہ مصر پر بھی ان کا قبضہ نہ ہو جائے، اور ذرا غفلت کریں تو ہر وقت مصری حکومت سے انھیں خطرہ ہو سکتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ اب ان فتوحات کے بعد عرب کی سیاسی حالت بھی بدل گئی تھی، اب وہ حالت نہیں رہی تھی، کہ ہمسایہ سلطنتیں اس ملک کو محض حقارت سے دیکھیں اور اپنے آپ کو ان عربوں سے جنھیں وہ اب تک لٹیرے سمجھتے آئے تھے محفوظ سمجھیں، عرب اب سیاسیاتِ عالم کا ایک جزء تھا، اور یہ ممکن تھا، کہ بازنطینی سلطنت اسلامی سیاسیات کے مرکز یعنی مدینہ پر حملہ کرکے اور اس نئی حکومت کا بالکل خاتمہ کر دے، چونکہ مدینہ اسوقت بازنطینی سلطنت کے فوجی مرکز قلزم (سویز) سے خطرناک طور پر قریب تھا، اس لئے اسکی اشد ضرورت تھی، کہ اس خطرہ کو جلد از جلد زائل کر دیا جائے، اس سے قطع نظر مصر دنیا کی تجارتی منڈی ہونے کے علاوہ ایک نہایت ہی زرخیز ملک تھا، اور اس کے غلہ سے قسطنطنیہ کی آبادی پلتی تھی، اس دار و گیر کے زمانہ میں ممکن ہے کہ مسلمانوں نے تجارت کو زیادہ اہمیت نہ دی ہو، لیکن یہ یقینی امر ہے کہ مصر کا غلہ عرب کی بے آب و گیاہ سرزمین کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا، ہمیں معلوم ہے کہ شام و عراق کی فتح کے بعد ان ممالک سے بے انتہا غلہ حجاز کو درآمد ہونا شروع ہو گیا، پھر ایسی صورت میں مصر کو کیوں چھوڑا جاتا، اس کا ہمیں علم ہے کہ فتحِ مصر کے دوران ہی یعنی (۱۸ھ م ۶۳۹ء) میں حجاز میں ایک سخت قحط پڑا، اسی وجہ سے اس سال کو عام الرمادہ کہتے ہیں، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے فاتحِ مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کو لکھا کہ مصر سے غلہ حجاز بھیجیں، حضرت عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا کہ وہ غلہ سے لدے ہوئے اتنے اونٹ بھیج رہے ہیں کہ پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا، اور آخری مصر میں[۱]، اس کے علاوہ مصر کے

---

[۱] ابن سعد جلد ۳۔ ص ۲۰۳، ۲۲۳، ۲۲۴،

سیاسی اور مذہبی حالات بھی اسوقت ایسے تھے کہ ہر بالغ نظر فاتح کی نگاہ اس ملک پر پڑ سکتی تھی، اس سے چند سال قبل تقریباً دس برس تک ایرانی اس ملک پر قابض رہ چکے تھے، اور اہل مصر نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان فاتحین کے زیر سایہ انھیں کم از کم مذہبی آزادی مل جائے گی، لیکن جب ہرقل نے اسے دوبارہ فتح کیا تو ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، اب بھی مصری یہ سمجھتے تھے، کہ گذشتہ واقعات سے فائدہ اٹھا کر سلطنت قسطنطنیہ اپنا طرز عمل بدل دے گی، اور انھیں مذہبی عقائد کے لحاظ سے آزاد چھوڑ دیگی، مگر ان کی یہ آرزو بھی بر نہ آئی، وہی پرانے مناقشات اور وہی پرانا مذہبی جبر و تشدد بدستور جاری رہا، اسلئے مصری اپنی حکومت سے بیزار اور کسی نئے نجات دہندہ کے لئے دست بدعا تھے، ایک اور خاص طور پر قابل غور بات یہ ہے، کہ اس زمانے میں مصر کا کلیسائی اور مالی نظم و نسق ایک ہی شخص کے سپرد ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مصریوں کی مخالفت نہ صرف مذہبی اختلافات کی بنا پر تھی، بلکہ اس کے معاشی اسباب بھی اتنے ہی اہم تھے، جتنے کہ مذہبی، ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے، عرب مورخوں کا یہ بیان قابل وثوق نہیں رہتا، کہ حضرت عمرؓ مصر پر حملہ کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے، اور حضرت عمرو بن عاصؓ ان کی اجازت کے بغیر اس پر حملہ آور ہوئے تھے، یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ زمانۂ جاہلیت میں مصر میں رہ چکے تھے، اس لئے وہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے،[۱]

لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ عمرو بن عاص حضرت عمرؓ کی اجازت سے مصر گئے تھے، بلکہ خود حضرت نے انھیں شام سے مصر جانے کا حکم دیا تھا،[۲]

۱۰ھ (۶۳۱ء) میں قیصر ہرقل نے سیرس (Cyrus) کو جو اب تک کاکیسوس کے شہر فیسس (Phasis) کا اسقف تھا، اسکندریہ کا بطریک مقرر کیا، اور اسی کو شہری نظم و

۱؎ الکندی کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ ص ۰، سیوطی حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۱۴۱، ابن عبد الحکیم فتوح مصر ص ۵۳

۲؎ ابن عبد الحکیم ص ۵۶، ۵۷،

نسق کا بھی حاکم بنایا، اس شخص نے دس سال تک مسلسل اور انتہائی کوشش کی کہ قبطی کلیسا سے صلح کرے، اور ملک کی آمدنی میں اضافہ کرے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسکی تمام کوششیں رائگاں گئیں، زمانۂ مابعد کی قبطی روایات میں اس شخص کی حیثیت برابر دھندلی ہوتی جاتی ہے، اس کے متعلق یہ فرض کیا گیا ہے کہ اس نے عرب فاتحین سے اہل ملک کے خلاف ساز باز کیا، اور اسی نے مصریوں کے سب سے زیادہ اہم شخص ہونے کی حیثیت سے عربوں کے ساتھ سب سے اہم عہد نامہ کیا، جس کی رو سے عرب مصر کے مالک بن گئے، یہی سیرس وہ شخص ہے جو اسلامی تاریخی روایات میں مقوقس کے نام سے مشہور ہوا،

ایک طرف مقوقس کی ناکامی تھی، اور دوسری طرف ہرقل نے شام کی لڑائیاں لڑنے کے لئے مصر کی مشرقی سرحد سے فوجیں ہٹالی تھیں، ان باتوں سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے فائدہ اٹھایا، اور ذی الحجہ ۱۸ھ (دسمبر ۶۳۹ء) میں اچانک اسلامی فوجیں مصر کی مشرقی سرحد پر ظاہر ہوئیں، اس کے ایک مہینہ بعد محرم ۱۹ھ (جنوری ۶۴۰ء) صرف تین چار ہزار فوج کے ساتھ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرما (Pelusium) فتح کر لیا، یہ مقام مصر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا لیکن حضرت عمرو بن عاصؓ نے اس سے آگے بڑھنے کی اس وقت تک ہمت نہیں کی جب تک کہ حضرت زبیر بن العوامؓ کی سرکردگی میں پانچ ہزار تازہ دم فوج مدینہ سے نہ آلی، اب پوری فوج آگے بڑھی، اور رجب ۱۹ھ (جولائی ۶۴۰ء) میں عین الشمس (Helis) کے سامنے بازنطینی سپہ سالار اغسطس تھیوڈورس کو شکست دی عین الشمس، بابل کے قریب واقع تھا، اور اس کا نواح سمجھا جاتا تھا، شہر تو فتح ہو گیا، مگر قلعہ کی فوج نے مدافعت کی، مقوقس یہاں بذات خود موجود تھا، اس نے مدافعت کا انتظام کرنے کے بجائے حضرت عمرو بن العاصؓ سے خط و کتابت شروع کی، اور معاہدہ کی شرائط طے کرنے کے بعد بغرض توثیق مصر سے ہرقل کے پاس چلا گیا، مگر قیصر اس عہد نامہ سے سخت ناراض ہوا، اس نے مقوقس پر غداری کا الزام لگا کر اسے جلاوطن کر دیا، اہل بابل اس عرصہ میں برابر مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہے، انھیں توقع تھی کہ ان کی مدد کے لئے فوجیں بھیجی

جائیں گی، لیکن ۲۰ صفر ۲۰ھ (۱۱ فروری ۶۴۱ء) کو ہرقل کا انتقال ہوگیا، اور جب مدد کی توقع نہ رہی تو ۱۲ ربیع الثانی ۲۰ھ (۹ اپریل ۶۴۱ء) کو محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے، بابل دریائے نیل کے اس حصے کی کنجی سمجھا جاتا تھا، اس لئے اس فتح سے ڈلٹا کے مشرقی حصے اور اس کے علاوہ مصر صعید پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا، اب حضرت عمرو بن عاص نے دریائے نیل کو عبور کیا اور اس کے مغربی کنارے کے ساتھ نیکو پہونچے، یہ ایک اسقفیہ کا مرکز تھا، ۲۰ رجمادی الاول (۱۳ مئی) کو اہل شہر نے اطاعت قبول کرلی، اب اسلامی فوج نے آہستہ آہستہ اسکندریہ کی طرف بڑھنا شروع کیا، اسکندریہ کی سیاسی بحری اور تجارتی اہمیت اتنی تھی کہ یونانی آسانی سے اُسے ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ مسلمان اس کے گرد و نواح کے علاقے پر بآسانی قابض ہوگئے، لیکن اس مستحکم اور قلعہ بند بندرگاہ کو فتح کرنا آسان کام نہ تھا، اس درمیان میں ہرقل کی موت کے بعد قسطنطنیہ میں بڑی سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے، مجبوراً مقوقس کو دوبارہ مصر بھیجا گیا، کہ جہاں تک بن پڑے، وہ حضرت عمرو ابن عاص کے ساتھ مفید مطلب شرائط پر صلح کرلے، وہ ۲ شوال ۲۰ھ (۱۴ ستمبر ۶۴۱ء) کو اسکندریہ واپس آیا، اب مقوقس نے کیا کیا سیاسی چالیں چلیں، اور کس طرح مسلمانوں سے ساز باز کیا، اس کا علم ہم کو نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ اب اس کا رویہ بالکل بدل چکا تھا، وہ علانیہ مسلمانوں کا ساتھ دے رہا تھا، غالباً اسے امید تھی کہ مسلمانوں کے ماتحت اُسے مصری کلیسا کا حاکم اعلیٰ مقرر کردیا جائے گا، اسی سال کے موسم خزان میں اُس نے اہل اسکندریہ کو اطلاع کئے بغیر حضرت عمرو بن عاص سے ایک معاہدہ کیا، جس کے مطابق قرار پایا کہ ۱۰ شوال ۲۱ھ (۱۷ ستمبر ۶۴۲ء) تک شہر ان کے حوالہ کردیا جائے گا، اور یونانی شہر خالی کردینگے ایک مقررہ خراج کے بدلے میں مسلمانوں نے اہل شہر کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا، اور انھیں پوری مذہبی آزادی عطا کی، اسکندریہ والوں کو اس عہد نامہ پر سخت غصہ آیا، مگر مجبور تھے، انھوں نے معاہدہ کو منظور کرلیا، اور یونانیوں نے شہر خالی کردیا، اسطرح اسکندریہ پر عربوں کا مکمل قبضہ ہوگیا، اس کے

بہت جلد بعد مقوقس کا انتقال ہوگیا، مصر پر اب مسلمانوں کا قبضہ مکمل ہوچکا تھا، مگر اس کی حقیقی تکمیل اسوقت ہوئی جب ۲۲ھ (۶۴۳-۴۴ء) میں حضرت عمرو بن عاصؓ نے برقہ کو جو افریقیہ اور مصر کی سرحد پر واقع تھا فتح کیا، اب تک اسکندریہ مصر کا صدر مقام تھا، لیکن عمرو بن عاص نے اسے ترک کرکے بابل کے سامنے اپنے پرانے لشکر گاہ کو فسطاط کے نام سے ملک کا صدر مقام قرار دیا[۱]، لیکن اسکندریہ جیسے شہر کو یونانی کس طرح چھوڑ سکتے تھے، ایک مرتبہ بازنطینی حکومت نے شہر پر قابض ہونا چاہا، ۲۵ھ یا ۲۶ھ (۶۴۵ء) میں یونانیوں کا ایک بیڑا امینول کی سرکردگی میں اسکندریہ پہونچا، اہل شہر نے جو اب تک عربوں سے مطمئن نہیں تھے، فوراً اطاعت سے انحراف کیا، اور یونانیوں کو شہر میں داخل کرلیا، اس موقع پر حضرت عمرو بن عاص مصر کے عامل موجود نہ تھے، ان کا جانشین صورتِ حال کو نہ سنبھال سکا، اس لئے انھیں واپس بھیجا گیا، انھوں نے پھر اپنی اعلیٰ فوجی قابلیت کا اظہار کیا، اور تھوڑی مدت میں شہر خالی کرالیا، اس طرح اسکندریہ مستقل طور پر بزور شمشیر فتح ہوا، حالانکہ پہلی فتح بذریعہ صلح تھی، اس سے مصر کی جنوبی اسلامی سرحد کا بھی فیصلہ ہوگیا، بالعموم مصر کی سرحدیں قدرتی طور پر معین ہوتی ہیں، شمال میں بحیرۂ روم ہے، مغرب میں لیبیا کا صحرا، اور مشرق میں عرب کا ریگستان اور بحیرۂ احمر ہے، صرف جنوبی سرحد واقعات کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی تھی، اس سمت کی حدبندی حضرت عثمانؓ کے والی مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی ایک فوجی مہم نے کردی عبداللہ بن سعد اسکندریہ کی دوسری فتح سے کچھ قبل عمرو بن عاص کے جانشین ہوئے تھے، اور حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ذرا قبل تک مصر کے حاکم رہے، انھوں نے ۳۱ھ (۶۵۱-۵۲ء) میں جنوب مصر میں نوبیہ کی مسیحی سلطنت کے شہر اسوان پر فوجکشی کی، اور دُنقلہ تک آئے، یہاں نوبیہ کے بادشاہ سے ایک عہد نامہ طے کیا، جو بقط کہلاتا ہے، بظاہر یہ لفظ لاطینی (Pactum.) کی معرب شکل ہے، یہ عہد نامہ اب تک محفوظ ہے[۲]، اس کی رو سے مسلمانوں اور اہل نوبیہ کے سیاسی تعلقات کا

[۱] دیکھو بکر (Beckar) کا مضمون کا ترو "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ۲ خطط؛ (مصر ۱۳۲۴ھ) جلد اصفحہ ۳۲۲

آغاز ہوا، چراکہ کے عہد تک بلاق (Philae) مصر کی جنوبی سلطنت سمجھا جاتا رہا، سلطنت کا انتہائی شمالی شہر الاقصر کہلاتا تھا،

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب فتنہ شروع ہوا تو مصر ہی اس کا حقیقی مرکز تھا، مصر پر اس فتنہ کا اثر یہ ہوا کہ عبد اللہ بن سعد کو ملک چھوڑنا پڑا، اور بالآخر یہیں سے مفسدوں کی ایک جماعت ۳۵ھ (۶۵۶ء) میں مدینہ روانہ ہوئی، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مصر پر حضرت علیؓ کی طرف سے محمد بن ابی بکرؓ والی رہے، اگرچہ جنگ صفین کے خاتمہ کے بعد جب حضرت امیر معاویہ نے شام میں اپنی حکومت قائم کی تو ۳۸ھ (۶۵۸ء) میں عمرو بن عاص بھی وہاں پہونچے، اور محمد بن ابی بکر کو قتل کرکے امیر معاویہ کی طرف سے مصر پر قابض ہو گئے، اس کے بعد ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) تک سوائے ایک مختصر سے عرصے کے (۶۴ھ سے ۶۵ھ م ۶۸۳ء سے ۶۸۴ء) جب کہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اس پر برائے نام قابض رہے، مصر بنی امیہ کے قبضے میں رہا، بنی امیہ کے دور میں مصر کا سب سے بڑا اور مشہور حاکم خلیفہ عبد الملک کا بھائی عبد العزیز تھا، یہ شخص اپنے بھائی سے مساویانہ سلوک کرتا تھا، اور مصر کے مفاد کی خاطر اس کے احکام کو رد کرنے میں بھی تامل نہ کرتا تھا، ۷۰ھ میں فسطاط (مصر) میں طاعون پھیلا، تو عبد العزیز فسطاط سے حلوان چلا آیا جو دو فرسخ کے فاصلہ پر دریائے نیل کے کنارے واقع ہے، یہ جگہ اسے ایسی پسند آئی، کہ مستقل طور پر اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی، اُس نے وہاں محلات اور مکانات بنائے اور باغ لگائے، اسی کی بدولت وہاں کھجور کے درخت اور انگور پہونچے، حلوان ہی سے وہ مصر پر حکومت کرتا تھا[1]، واقعہ یہ ہے کہ عبد العزیز ہی تھا جس نے مصر کے نظم و نسق کو حقیقی طور پر مرتب کیا، اور اسے ایسی شکل دے دی کہ جو والی اس کے بعد آئے انھوں نے اسی کے اصولوں پر عمل کرکے شہرت حاصل کی، عبد العزیز اپنے باپ مروان کی فتح مصر کے بعد ۶۵ھ (۶۸۴ء) میں حاکم مقرر ہوا، اور خلیفہ عبد الملک کی وفات سے چند ماہ قبل ۸۶ھ (۷۰۵ء) میں اس نے انتقال کیا، اس کے بعد عبد الملک نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو

۱؎ الکندی ص ۴۹، یاقوت معجم البلدان تحت "حلوان"

وہاں کا والی مقرر کیا، حالانکہ اسکی عمر اسوقت صرف ستائیس برس کی تھی، اس کا زمانۂ ولایت اسلئے مشہور ہے کہ اس نے خلیفہ ولید کے حکم سے دواوین مصر کو قبطی زبان سے عربی میں منتقل کیا، اور عربی کو دفتری زبان قرار دیا[1]، اس عہد کا ایک اور مشہور حاکم عبد الملک بن مروان بن موسیٰ بن نصیر تھا یہی بنی امیہ کا آخری حاکم مصر تھا، اسے ۱۳۱ھ (۷۴۸ء) میں مروان ثانی نے حاکم مصر مقرر کیا تھا، اس کی شہرت کی وجہ یہ ہے کہ یہی والی تھا جس کے حکم سے مصر کے دوسرے حصوں کی مسجدوں میں منبر قائم کئے گئے، اس سے قبل ان حصوں کے والی بغیر منبروں کے خطبہ پڑھا کرتے تھے[2]، ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) کے انقلاب کا اثر مصر پر بھی پڑا، یہاں کے اکثر عمائد مسودہ میں شامل ہو گئے، بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی نے مصر میں پناہ لی یہیں ذی الحجہ ۱۳۲ھ (اگست ۷۴۹ء) کے آخر میں بوصیر کے گرجا میں قتل ہوا، اس واقعہ نے قبطی کلیسا پر بھی اپنا اثر چھوڑا ہے، چنانچہ قبطی روایات میں بھی اس قتل کی تفصیل عرب مورخوں سے کہیں زیادہ ملتی ہے، لیکن اس سے قطع نظر مصر کی سیاسیات پر اس انقلاب کا اور کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا،

عہد عباسیہ میں مختلف والی مصر پر مقرر ہوئے، ۲۴۲ھ (۸۵۶ء) تک اکثر والی عرب تھے، مصر کا آخری عرب والی عنبسہ بن اسحاق تھا،

یہی آخری والی تھا جس نے لوگوں کے ساتھ جامع مسجد میں نماز پڑھی[3]، اس کے بعد ترک والیانِ مصر کا دور شروع ہوا، یہاں تک کہ ۲۵۴ھ (۸۶۸ء) میں احمد بن طولون نے ایک نیم خود مختار ترکی خاندان کی بنا ڈالی، مامون کے عہد سے خلیفہ اور والیوں میں یہ سمجھوتہ سا ہو گیا تھا کہ صوبہ کا والی شاذ و نادر ہی بذاتِ خود اپنے صوبہ کو جاتا تھا، بلکہ کسی دوسرے کو اپنا نائب مقرر کر دیتا تھا، اور خود دار الخلافہ کے عیش و طرب سے حظ اٹھاتا تھا، چنانچہ پہلے ترک حاکم یزید بن عبد اللہ نے بھی اپنے بھائی عباس بن عبد اللہ کو بطور نائب مصر بھیج دیا تھا[4]،

(باقی)

۱؎ الکندی ص ۵۸، ابن تغری بردی جلد ۱ ص ۳۲ ۲؎ ابن عبد الحکم ص ۱۲۲ ۳؎ الکندی ص ۹۴، ابن تغری بردی جلد ۱ ص ۳۵۱
۴؎ الکندی ۲۰۲، ۵؎ ،، و ابن تغری بردی جلد ۱ ص ۲۰۸،

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان اور ایران کے قدیم تعلقات

حال میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن (لندن) کے ایک جلسہ میں سر آرل اسٹائن (Sir Aurel Stein) نے ہندوستان اور ایران کے قدیم تعلقات پر ایک مقالہ پڑھا تھا، جو سنڈے اسٹیٹسمین مورخہ ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء میں نقل ہوا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے، سر آرل آثار قدیمہ کے ایک ممتاز ماہر ہیں، اور انھوں نے ایشیائی ادب اثریات، اور جغرافیہ پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، سنہ ۱۸۸۸ء سے سنہ ۱۸۹۹ء تک وہ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں، لاہور ہی کے زمانہ قیام میں انھوں نے اپنی اثری تحقیقات شروع کیں، اور سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک مہم ترکستان لے گئے، اس کے بعد تیس سال تک وہ وسط ایشیا، ایران اور بلوچستان میں آثار قدیمہ کی دریافت و تحقیق میں مصروف رہے، اور یہ انہی کی تحقیقات کا نتیجہ تھا، کہ ان ملکوں کے عظیم الشان قدیم تمدن کا جو ابتک تقریباً نامعلوم تھے سراغ لگ سکا،

ہندوستان اور ایران کے قدیم تعلقات پر تاریخ کی روشنی چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط سے پہلے نہیں پڑتی، جب کہ ایران کی عظیم الشان سلطنت کے بانی سائرس (Cyrus) نے اپنی سلطنت کے حدود گندھارا (قندھار) تک وسیع کر دیئے، اور اس میں پوری وادی کابل شامل ہو گئی، اس سے قبل کے حالات کے لئے ہمیں چند سال پیشتر تک زیادہ تر ان اشارات پر بھروسا کرنا پڑتا تھا، جو رگ وید کے گیتوں میں ملتے ہیں، سو برس سے زیادہ ہوئے، کہ مغرب میں سنسکرت کے فاضلوں نے ان مقدس گیتوں کا مطالعہ

تنقیدی نظر سے شروع کیا، اس وقت سے ان گیتوں کے ذریعہ ہندوستان کے قدیم ترین آرین باشندوں کے مذہبی عقائد، مذہبی نظام، رسم و رواج، معاشرتی حالات وغیرہ کے متعلق بہت زیادہ معلومات حاصل ہوئے ہیں، ان گیتوں کا زمانہ پندرھوین صدی قبل مسیح سے لیکر آٹھوین صدی قبل مسیح تک سمجھا جاتا ہے، اگرچہ ان گیتوں کے زمانہ تالیف کی نسبت اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ ویدک عہد کے ہندی آریائی باشندے زبان اور نسل میں ان آرین لوگوں سے بہت قریبی تعلقات رکھتے تھے، جنھوں نے ایران کو اپنا نام دیا،

ویدک گیتوں کی زبان اوستا کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے، جو ایران کے زرتشتی مذہب کی مقدس کتاب ہے، یہ بات گاتھا کی زبان میں خاص طور پر پائی جاتی ہے جو اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے، اور جس میں خود زرتشت کی تقریریں درج ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ جو لوگ قدیم مشرقی ایرانی زبان بولتے تھے، اور جو زرتشت کی تعلیمات کے براہ راست مخاطب تھے، وہ کسی زمانہ میں اُن آرین لوگوں سے قریبی تعلق رکھتے تھے، جن کے درمیان رگ وید کے گیت تصنیف کئے گئے، زرتشت کا زمانہ ابھی تک صحیح طور پر متعین نہ ہو سکا، اور اس کے گاتھا سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس مقام پر پیدا ہوا، یا کہاں اس نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی، لیکن اوستا کے دوسرے حصوں سے ان مقامات کی واقفیت ظاہر ہوتی ہے، جو ہندوستان اور ایران کی سرحدوں پر واقع تھے، چنانچہ وندیداد (Vendidad) کے پہلے باب میں ایرانی علاقوں کی جو فہرست دی ہوئی ہے، اس میں نہ صرف ہرات اور سیستان شامل ہیں، بلکہ رگ وید کے "سپتا سندھو" یعنی "سات دریا" بھی شامل ہیں، اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یاشت (Yashts) میں جو ایران کی ملکی روایات کی ایک نہایت قدیم منظوم کتاب ہے، اور جس کے زیادہ تر حصے زرتشت سے پہلے کے ہیں، پسیناہ (Pisinah) کا ذکر ملتا ہے، یعنی کوئٹہ کے قریب کی موجودہ وادی پشین، نیز ایسے مقامات کا ذکر بھی ہے، جن سے کابل اور پشاور کے قریب کے پہاڑی خطوں اور وادی بلند کے

چھوٹے چھوٹے دریاؤں سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے،

رگ وید کے گیتوں سے اس امر کی جزانی شہادت ملتی ہے، کہ شمالی ہند کے آرین حملہ آور پنجاب میں قیام پذیر ہونے سے بہت پہلے جہاں ان گیتوں کا بڑا حصہ تصنیف ہوا، موجودہ شمالی مغربی سرحد کے علاقہ سے واقف تھے،، رگ وید کے ایک مشہور گیت میں پنجاب کے تمام دریاؤں کا ذکر ستودرو (ستلج) سے کوبھا (دریائے کابل) تک صحیح ترتیب کے ساتھ موجود ہے، ان کے علاوہ کرومو اور گوماتی یعنی موجودہ دریائے کرم اور گومل کا ذکر بھی پایا جاتا ہے، یہ دونوں چھوٹے چھوٹے دریا ہیں، ان کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے، کہ آرین قبیلے وزیرستان اور اس کے قریب کی وادیوں سے جہاں یہ دریا بہتے ہیں، اچھی طرح واقف تھے، اور یہ واقفیت اس مقام پر ان کے طویل قیام سے حاصل ہوئی تھی،

افغانستان کے موجودہ دریائے ارغنداب کا اوستی نام ہرہ وتی (Harahvati) ہے، یہ دریا قندھار کے زرخیز علاقہ میں بہتا ہے ہرہ وتی دریائے سرس وتی کا ٹھیک مقابل ہے جو رگ وید کے گیتوں کا ایک مشہور دریا ہے، ویدک سنسکرت کا حرف (س) اوستی زبان کے حرف (ہ) سے ہمیشہ بدل جاتا ہے،

یہ یقینی طور پر نہیں معلوم کہ ہند و ایران کے سرحدی علاقہ میں آرین لوگ کس سمت سے داخل ہوئے لیکن خواہ وہ شمال کی طرف سے روسی ترکستان سے آئے ہوں، یا مغرب کی طرف سے ایران سے ہو کر، یہ ظاہر ہے کہ ہرات اور وادی ہلمند کا کھلا ہوا خطہ اپنے طبعی حالات کی بنا پر ان کے پھیلنے کے لئے سب سے زیادہ آسان راستہ رہا ہوگا، موجودہ نظریہ یہ ہے، کہ یہ لوگ شمال مغرب سے آئے یہ واقعہ کہ بعد کے زمانہ میں بھی ایرانی قبیلے مثلاً ساکا دریائے جیحون کے علاقہ میں پائے جاتے تھے، اس نظریہ کو تقویت پہنچاتا ہے، لیکن ان کے آنے کی دوسری راہ یعنی مغرب کی طرف سے بالکل ناقابل توجہ نہیں قرار دیجا سکتی، کیونکہ ایشیائے کوچک میں چودھویں صدی قبل مسیح کے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں، ان سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ

جو قوم متانی (Mitanni) کے علاقہ میں شمالی عراق کے قریب آباد تھی، وہ ان دیوتاؤں کی پرستش کرتی تھی، جو رگ وید کے گیتوں میں نمایاں ہیں، نیز چند ویدک الفاظ بھی استعمال کرتی تھی،

موہنجوداڑو (سندھ) میں جو آثار قدیمہ حال میں برآمد ہوئے ہیں، ان سے ایک ایسے تمدن پر روشنی پڑتی ہے، جو تقریباً ڈھائی تین ہزار سال قبل مسیح کا ہے، یہ ایک بلند تمدن تھا، جیسا کہ انکشافات سے ظاہر ہوتا ہے، مثلاً مکانوں میں حمام، آتشدان، اور موریاں وغیرہ بھی ہوتی تھیں، اور سڑکیں پتھر کی پٹریوں کی تھیں، دھات کی صنعت پوری طرح ترقی کر چکی تھی، چھوٹے چھوٹے سنگ تراشی کے نمونوں اور کندہ کی ہوئی مہروں سے فنی مہارت کا ثبوت ملتا ہے، عمدہ قسم کی پکی مٹی کے برتن بھی عام تھے، لیکن سب سے زیادہ اہم انکشاف مذہبی خیالات کی قدامت ہے، یہ خیالات ویدک خیالات سے بالکل مختلف ہیں، اور صاف طور پر زمانہ قبل آرین کے معلوم ہوتے ہیں، پھر بھی ہندوستان کے عام مذہبی نظاموں میں غالب ہیں، اسکی شہادت متعدد چیزوں سے فراہم ہوتی ہے، جو ہندوستان کے پرستش کے طریقوں کے لئے مخصوص ہیں، مثلاً لنگ، یونی، مقدس سانڈ کی تصویریں، اور "سکتی" یا "ماتا دیوی"، (Mother Goddess)

اس کے بعد یہ ضروری معلوم ہوا کہ "سندھی تہذیب" اور "مشرق ادنی" کے قدیم مقامات کے ابتدائی تمدن یعنی کلکالیتھک تمدن (Chalcolithic culture) کا درمیانی تعلق دریافت کیا جائے، ۱۹۲۵ء میں مسٹر ہارگریوز (Hargreaves) نے نال کے مقام پر جو ریاست قلات میں واقع ہے، کلکالیتھک (Chalcolithic) عہد کا ایک قبرستان کھود کر برآمد کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر دریائے سندھ کے مغرب میں ایک وسیع پیمانہ پر کھودائی کا کام شروع کیا جائے، تو کیا کچھ نہ دستیاب ہوگا، خوش قسمتی سے مجھے اس کا موقع مل گیا، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے مجھے برطانوی ہند کی انتہائی مغربی سرحد پر دو مہمیں لیجانی پڑیں، ان میں سے پہلے سفر میں میں نے وزیرستان کی پہاڑیوں کے دامن میں اور ژوب (Zhob) اور پشین کی وادیوں میں

زمانہ قبل تاریخ کے متعدد مقامات پر کھدوائی کرائی، دوسرے سفر میں برطانوی مکران کے ایک وسیع علاقہ میں کھدوائی ہوئی، اور وہاں مجھے بحر عرب کے ساحل تک تقریباً اسی مقامات پر کلکا لیتھک عہد کی آبادیوں کے آثار ملے، جن علاقوں میں کھدوائی ہوئی تھی، ان کی وسعت شمال مشرق سے جنوب مغرب تک اندازاً (۲۵۰) میل اور جنوب میں تقریباً (۲۵۰) میل تھی، یہاں کے آثار قدیمہ سے یہ ثابت ہوگیا، کہ کلکا لیتھک عہد میں جو تمدن اس سرحدی علاقہ میں جاری تھا، وہ ہندوستان اور ایران کا متحدہ تمدن تھا، بعض مقامات پر مقدس سانڈ اور ماتا دیوی کے بت کثرت سے پائے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ جو مذہب موہنجو دارو میں رائج تھا، اور اصلاً ہندوستانی تھا وہی مغرب میں موجودہ ایرانی ہندی سرحد تک پھیلا ہوا تھا،

۱۹۲۹ء میں ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ سے علیحدہ ہونے کے بعد مجھے ان تحقیقات کے جاری رکھنے کا موقع چار بار اور ملا، اور میں برطانوی مکران کی جنوبی مغربی سرحد سے آگے بڑھ کر جنوبی ایران کی پوری وسعت کو طے کرتا ہوا کردستان تک چلا گیا، انھیں سے پہلے سفر میں میں ایرانی مکران کے درمیان سے ہو کر گذرا یعنی زیر بحث علاقہ کے مغربی حصہ سے اس خطہ میں کلکا لیتھک عہد کے قدیم مقامات پر جو چیزیں برآمد ہوئیں، اُن سے اُن چیزوں کی اہمیت پوری طرح واضح ہوگئی، جو سرحد کی برطانوی سمت میں دریافت ہوئی تھی، لیکن تعجب یہ ہے کہ مقدس سانڈ اور ماتا دیوی کے چھوٹے چھوٹے بت جو ہندوستانی مذہب کے علامات تھے، ان مقامات پر کہیں نہیں پائے گئے، کرمان، فارس، خوزستان، اور کرمان شاہ کے صوبوں سے لیکر کردستان تک تلاش و جستجو سے جو شہادتیں فراہم ہوئی ہیں، ان کی بنا پر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، کہ جہاں جہاں مستقل بود و باش ممکن تھی، کلکا لیتھک تمدن یکساں طور پر رائج تھا،

لہذا ان قدیم زمانوں میں بھی ہندوستان اور مشرق ادنی کے درمیان ایران کے راستہ سے پر امن آمد و رفت اور تجارت کا امکان فرض کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد بھی ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے، کہ زمانہ قبل تاریخ کے اس قدیم تمدن (کلکا لیتھک تمدن) کی نشو و نما، اور ترقی ابتداءً کس مقام پر ہوئی، آیا ایران میں ہوئی، یا کسی اور ملک میں، بحر عرب اور خلیج فارس کے ساحلوں پر میں نے وادی سندھ اور عراق عرب کے درمیان زمانہ قبل تاریخ کی بحری تجارت کے آثار تلاش کئے، لیکن کامیابی نہ ہوئی، تاہم اسلامی عہد کے اس قسم کے آثار کثرت سے پائے گئے، لیکن اس ساحل کے تہ آب ہوجانے سے جیسا کہ بعض مقامات پر میرے مشاہدہ میں آ چکا ہے، اس سلبی شہادت کی وہ اہمیت باقی نہیں رہتی، جو بصورت دیگر اسے حاصل ہوتی،

ایران اور ہندوستان کی سرحد کو پار کر کے جو آرین قبیلے سندھ اور پنجاب میں آکر آباد ہوئے، ان کی زبان ویدک سنسکرت تھی، اور ان کی آمد زمانہ قبل تاریخ میں ہوئی، اس زمانہ کے حالات آثار قدیمہ کی مدد سے ابھی تک معلوم نہیں ہوسکے ہیں، اور نہ آرین لوگوں کے حملہ کے وقت وادی سندھ اور اس سے آگے کے علاقہ کا تمدن دریافت ہوسکا ہے، البتہ مغرب کے ان زرخیز علاقوں سے ملے ہوئے جو علاقے تھے، ان کی طبیعی حالت کسی قدر معلوم ہوئی ہے، اگرچہ آرین فتوحات کے وقت اس علاقہ کی زمین بہ نسبت موجودہ زمانہ کے کم خشک رہی ہو، تاہم چونکہ قابل زراعت حصہ کم تھا، یہ حملہ آور نیم خانہ بدوشی کی زندگی پہاڑیوں پر بسر کرتے رہے ہوں گے، قدرۃً ان کے دل میں اپنے قلیل وسائلِ معاش کو بڑھانے کا خیال پیدا ہوا ہوگا اور اس کے لئے میدانوں کے زراعت پیشہ لوگوں پر حملہ کرنے کی خواہش ہوئی ہوگی، ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے بعد پٹھان قوم موجودہ شمالی مغربی سرحد کی طرف سے ان میدانوں پر حملہ آور ہوئی، یہ زراعت پیشہ قومیں جو میدانوں میں آباد تھیں، جسمانی قوت میں ان کے برابر نہ رہی ہوں گی، اگرچہ تمدنی حیثیت سے وہ ان سے بہتر رہی ہوں گی، وادی سندھ کا تمدن اس وقت تک اُس سطح سے نیچے اُتر آیا ہوگا، جس سطح پر موہنجو دارو کے آثار قدیمہ سے تمدن کا پتہ لگتا ہے، لیکن خواہ صورت حال کچھ بھی رہی ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ جو قوم آرین حملہ سے مغلوب ہوگئی، اس میں غیر ملکی فاتحوں کو اپنے اندر جذب اور ہضم کرنے کی وہ قوت تھی جسے ہندو مذہب نے اکثر تاریخی ادوار میں ظاہر کیا ہے،

اس میں شبہ نہیں کہ یہ عمل بڑی حد تک جاری رہ چکا تھا، جبکہ سائرس (۵۵۸ لغایۃ ۵۳۰ ق م) کی فتح گندھارا (قندھار) کے ساتھ تاریخ کی روشنی ہندوستان کی انتہائی شمالی مغربی سرحد پر پڑتی ہے، اس

صوبہ میں نہ صرف پشاور کا ضلع شامل تھا، بلکہ پوری وادی کابل اور اس کے جنوبی علاقے بھی شامل تھے، اس فتح تو اور بھی وسعت ہوئی جب ۵۱۹ ق م کے بعد دارا (Darius) نے صوبۂ ہند کو قندھار میں شامل کریا، چونکہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) لکھتا ہے کہ صوبۂ ہند سلطنت ایران کا سب زیادہ آباد صوبہ تھا، اور سالانہ خراج بھی سب سے زیادہ ادا کرتا تھا، اس لئے یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس میں دریائے سندھ کے دونوں جانب کے علاقے سندھ تک شامل تھے، ہیروڈوٹس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا کے جانشین کیخسرو (Xerxes) نے جب ۴۸۰ ق م میں یونان پر حملہ کیا، تو اس کی فوج میں قندھاریوں اور ہندوستانیوں کے دستے بھی شامل تھے، پروفیسر ریپسن (Rapson) نے سچ کہا ہے کہ غالباً قدیم تاریخ کے کسی دور میں بھی خشکی کے راستہ سے آمد و رفت کے ذرائع اس سے زیادہ کھلے ہوئے نہ تھے، اور نہ ہندوستان اور مغرب کے درمیان تبادلۂ خیالات کے لئے حالات اس سے زیادہ موافق تھے

بدقسمتی سے اس وقت تک کوئی متعین اثری شہادت اس امر کی بہم نہ پہونچ سکی، کہ ان صوبوں میں پوری دو صدیوں کے ایرانی تسلط نے کیا اثر چھوڑا، معلوم ہوتا ہے، کہ سلطنت ایران کے اور حصوں کی طرح ان صوبوں میں بھی ایرانی گورنروں نے براہ راست حکومت کا طریقہ جاری رکھا تھا، اُن کے انتظامی عمال اور فوجوں میں زیادہ تر لوگ سلطنت کے مغربی حصوں سے بھرتی کئے جاتے ہوں گے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا، کہ ان دو صوبوں کے ملکی تمدن پر اس کا کوئی اہم اثر پڑا ہوگا، ان صوبوں سے متعلق جو متفرق اور قلیل حالات بعد کے عہد کے معلوم ہو سکے ہیں، اُن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ ان کا تمدن اصلاً ہندوستانی باقی رہا، معلوم ہوتا ہے، کہ مشرق کے ان دور دراز صوبوں پر ایرانی شہنشاہوں کا تسلط رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا، لیکن جب سکندر ہندوستان کی مہم پر روانہ ہوا تھا، تو اس نے ان صوبوں کو اس وقت بھی سلطنت ایران ہی کا جزو پایا تھا، اور حق فتح کی بنا پر سلطنت ایران کے ساتھ ان کا بھی دعویدار ہوا تھا،

"ع ز"

اخبار علمیہ

بقائے شباب کا معمل

ڈاکٹر کیرل (Dr. Alexis Carrel) امریکہ کے ایک مشہور فاضل طب ہیں، حال میں انھوں نے بیمہ کمپنیوں کی ایک انجمن میں جس کا اجلاس نیویارک میں منعقد ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی ہے، کہ دائمی شباب کا راز دریافت کرنے کیلئے ایک مخصوص معمل قائم کرنا چاہئے، کیونکہ بقائے شباب کی فطری خواہش انسان کے دل سے کبھی دور نہیں ہوسکتی، اور اس وقت تک دنیا کے کسی حصہ میں کوئی ایسا معمل موجود نہیں ہے جہاں عمر کے انحطاط اور زندگی کی درازی کے مسئلہ پر مناسب طریقہ سے تحقیق ہوتی ہو، ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ اگر ایک معمل قائم کرکے سائنٹفک طریقہ پر اس مسئلہ کی تحقیق کی جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی حاصل نہ ہو، یہ خیال ان کے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے، انھوں نے شریانوں کے ٹکڑے جسم انسانی سے علحدہ کرکے تجربہ کیا ہے کہ وہ امتحانی نلی (Test-tube) میں ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں، اور کچھ دن ہوئے انھوں نے یہ تجربہ بھی کیا ہے کہ پورے پورے اعضا جسم سے علحدہ کرنے کے بعد بھی زندہ رکھے جاسکتے ہیں، ان تجربات کی بنا پر انھیں امید ہے، کہ انسانی جسم بھی مناسب طریقوں کے دریافت ہونے پر غیر محدود مدت تک زندہ رکھا جاسکتا ہے، موت جن اسباب سے واقع ہوتی ہے وہی دائمی زندگی کی راہ کی رکاوٹیں ہیں، سائنٹفک تحقیق ابھی تک اس نتیجہ پر پہونچی ہے، کہ موت کا غالباً ایک ہی سبب ہے، اور وہ سبب اتفاقی حادثہ ہے اتفاقی حادثہ ایک ایسا امکان ہے جس کا وقوع میں آنا عقل کی مدد سے روکا جاسکتا ہے تمام اطبا

کا تجربہ ہے کہ ہر بیماری کسی خاص سبب کا نتیجہ ہوتی ہے، اور وہ سبب کسی اتفاق سے پیدا ہوتا ہے، جو بیماریاں جراثیم سے پیدا ہوتی ہیں، ان میں تو یہ حقیقت ناقابلِ انکار طور پر نمایاں ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ عمر کا انحطاط فطری اور ناگزیر ہے، یا محض اتفاقی ہے، جسے مناسب تدبیروں سے روکا جاسکتا ہے، اس باب میں اطبار کا اختلاف ہے، ڈاکٹر کیرل نے جس عمل کی تجویز پیش کی ہے، اس میں اسی مسئلہ کی تحقیق کیجائیگی،

دنیا کے بہترین ہیرے کا افسانہ

پریٹوریا (ٹرانسوال) میں ایک شخص جیکوبس جونکر (Gacobus gonker) نامی تھا، جو اپنے افلاس سے نہایت پریشان رہا کرتا تھا، اسے قیمتی پتھروں کی تلاش کا شوق تھا، اور اکثر اپنا اوقات سنگریزوں کی پہچان بین میں بسر کیا کرتا تھا، ۱۹۳۴ء میں ایک روز اس کے علاقہ میں نہایت تیز بارش ہوئی، جس سے سطحِ زمین کی مٹی دھل کر بہ گئی، اور نیچے کے سنگریزے دکھائی دینے لگے، جونکر حسبِ معمول سنگریزوں کو کھود کھود کر دیکھنے لگا، اتفاق سے اس کی نظر ایک پتھر پر پڑی جس پر مٹی جمی ہوئی تھی، مٹی صاف کی، تو معلوم ہوا کہ ایک چمکدار ہیرا ہے، جو قد میں مرغی کے انڈے کے برابر ہے، اس کا وزن (۷۲۶) قیراط ہے، جونکر نے اسے تین لاکھ پندرہ ہزار ڈالر میں فروخت کر ڈالا، اس کے بعد یہ ہیرا لندن بھیجا گیا، جہاں کے جوہریوں نے فیصلہ کیا، کہ بڑے ہیروں میں یہ دنیا کا بہترین ہیرا ہے، اس کا رنگ نیلگون سفید ہے جو نادر سمجھا جاتا ہے، جون ۱۹۳۵ء میں امریکہ کا ایک جوہری اسے خرید کر نیویارک لے گیا، اور لانڈ کے مشہور کارخانہ میں اسے تراشنے کے لئے دیا، یہ ہیرا اتنا سخت تھا، کہ اس کا حسبِ خواہش کاٹنا محال معلوم ہوتا تھا، ایک خاص قسم کی آری سے جو فی منٹ پانچ ہزار چکر کی رفتار سے چلتی تھی کئی مہینوں میں اس کے تراشنے کا کام ختم ہوا، اور اس سے بارہ ہیرے بن کر تیار ہوئے، ان میں سب سے بڑا نمبر ۱ جونکر کے نام سے مشہور ہے، اور اس کا وزن (۱۴۳) قیراط ہے، جوہریوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نمبر ۱ جونکر دنیا کا سب سے زیادہ نادر ہیرا ہے، اور اس وجہ کر اسکی قیمت متعین کرنا دشوار ہے، سنٹ پال کمپنی (امریکہ) نے دس لاکھ ڈالر پر اسکا بیمہ کیا ہے

"زہر کھانے والے"

بعض لوگ کسی خاص غرض سے سنکھیا کھانا شروع کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس کی خوراک کی مقدار اتنی بڑھا دیتے ہیں، کہ دوسروں کے لئے اس کا خفیف جز بھی مہلک ہوتا ہے، لیکن آسٹریا کے صوبہ اسٹائریا میں آبادی کا بڑا حصہ آرسینک (سنکھیا) کھانے کا عادی ہے، جسکی وجہ سے وہ لوگ "سنکھیا کھانے والے" مشہور ہو گئے ہیں وہ سنکھیا کے اسی طرح عادی ہیں، جس طرح دوسرے لوگ شراب یا اور نشی چیزوں کے عادی ہوتے ہیں اُن کا بیان ہے کہ اس سے اُن کی صحت درست رہتی ہے، تکان نہیں محسوس ہوتی اور جسم میں غیر معمولی قوت پیدا ہوتی ہے، وہ لوگ بچوں کو شیر خوارگی کے زمانہ ہی سے آرسینک کھلانا شروع کر دیتے ہیں، اور جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے، آرسینک کی خوراک بھی بڑھاتے جاتے ہیں، مشکل یہ ہے کہ جب سنکھیا کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے، تو اُسے ترک نہیں کر سکتے، اسٹائریا کے لوگوں کا تجربہ یہ ہے کہ اسے بعد میں چھوڑ دینے سے صحت بہت جلد خراب ہو جاتی ہے، اور مریض یقیناً مرجاتا ہے، آرسینک کا ایک اثر جو انسانوں اور جانوروں دونوں پر نمایاں طور سے دیکھا جاتا ہے، یہ ہے کہ اس کے استعمال سے جسمانی صحت کے علاوہ جسمانی حسن میں بھی اضافہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسٹائریا کی لڑکیاں یورپ کے دوسرے حصوں کی لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں، آرسینک چہرے اور بالوں کی خوبصورتی میں خاص طور سے اضافہ کرتا ہے، اسٹائریا کے لوگ کئی پشتوں سے آرسینک کھاتے آئے ہیں، اور یہ زہر اُن کے بچوں کی گھٹی میں داخل ہوتا ہے، آرسینک کا (۱/۱۰) گرام ایک معمولی آدمی کو ہلاک کر دینے کے لئے کافی ہے، لیکن اسٹائریا کے باشندے بغیر کسی مضرت کے (۳) تین گرام کھا سکتے ہیں، حکومت آسٹریا نے زہر خوری کی اس عادت کو موقوف کرانے کی کوشش کی، لیکن اُسے زیادہ کامیابی نہ ہوئی، آرسینک بیچنے والے اسے پنیر کی شکل میں تیار کر کے گھر گھر فروخت کرتے پھرتے ہیں، اور کسان اسے مکھن کی طرح روٹی

پر لگا کر کھاتے ہیں، یہ اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ اسٹائریا میں قتل کے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں، لیکن ملزم سزایاب کم ہوتے ہیں، جس شخص کی جان لینی مقصود ہوتی ہے، اسے اس کی معمولی خوراک سے زیادہ مقدار میں آرسینک کھلا دیتے ہیں، چونکہ لوگ عام طور سے آرسینک کھانے کے عادی ہوتے ہیں، اس لئے عدالت کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے، کہ کسی دوسرے نے قتل کی غرض سے آرسینک کھلا دیا تھا،

ترکی مین لڑکیون کی فوجی تعلیم

انگریزی اخبار آبزرور (Observer) کا نامہ نگار قسطنطنیہ سے اطلاع دیتا ہے، کہ ترکی حکومت کے شعبۂ تعلیم کی طرف سے ایک حکم اس مضمون کا صادر ہوا ہے، کہ "ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ اور یونیورسٹی کی تمام لڑکیون کے لئے فوجی تعلیم ضروری قرار دی جائے، معلوم ہوتا ہے کہ فوجی نصاب کی مدت دو سال رکھی گئی ہے، پہلے سال کے مضامین یہ ہین: فوجی بھرتی اور نقل و حرکت کے ابتدائی اصول فوجی نظم و تادیب اور فوجی قانون، اس کے بعد لڑکیون کو اسلحہ اور نقشوں کے استعمال کرنیکے طریقے بتائے جائیں گے، اور ہوائی حملوں کی مدافعت، طبی امداد، اور فوجی اطلاعات بہم پہونچانے کی تعلیم دی جائے گی، فوجی تاریخ کے اسباق بھی پہلے سال کے نصاب میں داخل ہیں، دوسرے سال کا نصاب حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے، مشین گنون کا استعمال گولوں اور توپخانوں کی تعلیم، شہروں اور دوسرے اہم مقامات کا تفصیلی نقشہ، صف آرائی، اور محاذ جنگ کے پیچھے کام کرنے کی تعلیم،

"ع ز"

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانون کے مذہبی اخلاقی تمدنی سیاسی اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان میں لکھے ہیں، ضخامت ۲۴۴ صفحے قیمت: ۔ عہ

"منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی (معتمد افواج سرکار عالی حیدرآباد دکن)

بے حجابانہ جب آجاتا ہے، اک قیامت سی اٹھا جاتا ہے،

حشر اٹھاتا ہے ترا دیوانہ گر کبھی ہوش میں آجاتا ہے،

لو خبر اپنے مریض غم کی، حال کچھ غیر سنا جاتا ہے،

دیکھتا ہوں جو کسی کا جلوہ روح پر نشہ سا چھا جاتا ہے،

اک حقیقت ہے میری حیرانی کوئی آئینہ دکھا جاتا ہے،

دیکھ اس بزم میں اے ہوش نہ جا

سوچ کر کام کیا جاتا ہے،

جذبات اثر

نواب جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی

اک راز ہے تعلیم نہیں ہو سکتا بے معرفت میم نہیں ہو سکتا،

احمد کے بغیر احد ملے ناممکن نقطہ کبھی تقسیم نہیں ہو سکتا،

دریا ہوتا ہے چشمۂ رفتہ رفتہ کھلتی ہے نوائے زخمہ رفتہ رفتہ

بڑھتی ہی یونہی روح بھی منزل کی طرف ہوتا ہے فروغِ نغمہ رفتہ رفتہ

کچھ بھی نیکی بدی جو سوجھی ہوتی قطرے سے پتہ کی بات پوچھی ہوتی

اے منکرِ ترتیبِ نظامِ حکمت پہلے اپنی پہیلی بوجھی ہوتی

جب ڈیری بہار کے پڑے ہوتے ہیں غنچے بھی نمود پر اڑے ہوتے ہیں

یوں پھوٹتی ہے کے پھریری کونپل سب جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

پردہ میں کلی کے مسکراتی آئی آغوش میں گل کے لہلہاتی آئی

انگڑائیاں لیتی ہوئی جاگی ہر شاخ البیلی بہار گنگناتی آئی

تم اور غریبوں پہ ترس رہنے دو آئے بڑے بن کے دادرس رہنے دو

تم اور پشیمان دل آزاری سے ہاں کیا کہا پھر کہو بس رہنے دو

نقوشِ جذبات

از جناب حبیب صاحب اشعر دہلوی

یہ غفلت میں رہ کر نہ ہوشیار ہو کر اسے ڈھونڈیئے سب سے بیزار ہو کر

نرالی ہیں بازارِ الفت کی رسمیں بکے جا رہے ہیں، خریدار ہو کر

تری یاد موقوف ہے بیخودی تک تجھے بھول جائیں گے ہشیار ہو کر

ودیعت گہِ دولتِ غم بنا ہوں، یہ دل کام آیا ہے بے کار ہو کر

یہ سب عشق کی کارفرمائیاں ہیں، دو عالم سے چھوٹے گرفتار ہو کر

عیادت کو میری چلے آ رہے ہیں ملی دولتِ دید بیمار ہو کر

شرابِ خودی سے ہیں سرشار اشعر ہوئے اور بدمست ہشیار ہو کر

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر

نیسان جوبلی نمبر، مرتبہ پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت ۱۲ر، پتہ اردو ایسوسی ایشن الہ آباد یونیورسٹی،

گذشتہ دسمبر میں بڑے تزک و اہتمام کے ساتھ الہ آباد یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی منائی گئی، اس کی یادگار میں یونیورسٹی مذکور کے اردو ایسوسی ایشن کے سہ ماہی رسالہ نیساں کا جوبلی نمبر نکلا ہے، جو ہر لحاظ سے توقع کے مطابق ہے، اس نمبر میں مختلف ذوق کے علمی ادبی تاریخی مضامین ستھرے افسانے اور دلچسپ نظمیں فراہم کی گئی ہیں، ابتداء میں فاضل اڈیٹر کے قلم سے الہ آباد یونیورسٹی اور اس کے شعبۂ اردو کی تاریخ ہے، اس کے بعد مضامین کا سلسلہ ہے، علمی مضامین میں لفظ "نیساں" کی تاریخی تحقیق پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، "وقت" "بچوں کی تعلیم میں زبان کی اہمیت" "دورِ حاضر کی انگریزی شاعری" "قصیدہ پر ایک نظر" "حیات کی بنیادیں اور ارتقاء" اچھے مضامین ہیں "مسلمان اور ریاضیات" بھی مفید مضمون ہے، مگر معلوم ہوتا ہے، کسی انگریزی ماخذ سے لیا گیا ہے، اس لئے ناموں کے املا میں غلطیاں ہیں "اردو زبان کی تحقیق میں چند مشکلات" کے سلسلہ میں تحقیق کا قدم بہت آگے بڑھ چکا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اردو کی پیدائش کو کسی خاص زمانے یا خاص غرض کیساتھ مخصوص کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے میل جول سے فطری طور سے پیدا ہوئی، اور ان کے تمدن کے فروغ کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی تا آنکہ مغلوں کے زمانہ میں مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی، ادبی مضامین میں اکبر الہ آبادی "دورِ حاضر کے چند

شاعر اور افسانوں میں "سندری سماج" اور "اندھیری راتیں" لائق ذکر ہیں،

اردو مسعود نمبر، مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے، ضخامت ۴۰۰ صفحے، اس نمبر کی قیمت غالباً عہ
یا عہ ہوگی، پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن،

اس قحط الرجال کے دور میں سید راس مسعود مرحوم کی قبل از وقت وفات ایک قومی حادثہ ہے، ان کی ساری زندگی علم و تعلیم کی خدمت میں گذری، وہ جہاں جہاں رہے، تعلیم ہی کی خدمت ان کا مشغلہ رہا، گو ان کی نشو ونما انگریزی ماحول میں ہوئی تھی، لیکن ان کی قومی حمیت نے ان کو اپنے تمدن سے بیگانہ نہ ہونے دیا، اپنی زبان سے ان کو دلی لگاؤ تھا، اور وہ اس کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے، جس کا ثبوت ان کا "انتخاب زریں" ہے، انھوں نے ہندوستانی زبان کی متعدد بہ خدمت کی، سرکار نظام میں تحریک کرکے "مراثی میر انیس" کا ایک بہترین اڈیشن شائع کرایا، انجمن ترقی اردو کے صدر تھے، ہندوستانی زبان کے سب سے بڑے ادارہ "عثمانیہ یونیورسٹی" کا تخیل اگرچہ بہت قدیم ہے، اور اس کا خاکہ بنانے والے پرانے بزرگ تھے، لیکن اس کا عملی تجربہ اور فروغ راس مسعود ہی کے نظامت تعلیم کے زمانہ میں ہوا، اس لحاظ سے وہ ہندوستانی زبان کے محسنوں کی صف اول میں ہیں، ان کے ان خدمات کا سچا ذکر کرکے انجمن ترقی اردو کے رسالہ نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکالا ہے، جس کے وہ بجا طور سے مستحق تھے،

اس نمبر میں مرحوم کے بہت سے اہل علم ہندوستانی اور انگریز احباب اور تعلق رکھنے والوں نے مرحوم کے حالات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے ہیں، ان لکھنے والوں میں مولوی عبدالحق صاحب بی اے، سر شیخ عبدالقادر، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، سید عبدالعزیز بیرسٹر پٹنہ، سید محی الدین صاحب پرنسپل عثمانیہ کالج، مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد، میاں بشیر احمد اڈیٹر ہمایوں، اور متعدد انگریزوں کے نام ہیں، جن کا مرحوم کا یورپ یا ہندوستان میں ساتھ رہ چکا ہے، اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، انگریزوں کے مضامین کا اصل کے ساتھ ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے، اس طرح یہ نمبر راس مسعود مرحوم کے حالات کا اچھا مرقع بن گیا ہے، جس میں ان کی سیرت اور ان کے کارناموں کی

پوری تصویر نظر آجاتی ہے،

جامعہ مرتبہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۵ صفحے، کاغذ کتابت
وطباعت بہتر قیمت جنوری نمبر عہ ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

جامعہ ہندوستان کے سنجیدہ اور ممتاز رسائل میں ہے، اس نے مذاق عام سے اپنا دامن بچائے رکھا، اور ہمیشہ اپنے ناظرین کے لئے مفید اور کارآمد لٹریچر پیش کرتا ہے، اس نے غالباً کبھی کوئی خاص نمبر نہیں نکالا ہے، لیکن جنوری کا پرچہ مضامین کی نوعیت اور ضخامت کے لحاظ سے خاص نمبر بن گیا ہے، اس میں ۱۹۳۷ء کے ساری دنیا کے سیاسی حالات و مسائل پر تبصرہ ہے، سب سے پہلے اپنے گھر یعنی ہندوستان میں جدید دستور کے قیام اور اس کے نتائج اور یہاں کے اہم معاشی اور تجارتی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور آیندہ اصلاحی پروگرام میں کانگریسی حکومتوں کو مفید مشورے دئے گئے ہیں، اس کے بعد بین الاقوامی سیاسیات میں برطانیہ، امریکہ، روس، اٹلی، اسپین، جرمنی، فرانس اور جاپان کے سیاسی مقاصد ان کی باہمی کشاکش اور اس کے نتائج کو دکھایا گیا ہے، پھر اسلامی ممالک میں شمالی افریقہ، طرابلس، مصر، سوڈان، حبش، یمن، نجد و حجاز، شام و عراق، ترکی اور فلسطین کے داخلی اور خارجی حالات، یورپین حکومتوں سے ان کے سیاسی تعلقات اور ان سے ان کے اغراض و مقاصد اور اس کے اثرات و نتائج کو پیش کیا گیا ہے، ان بین الاقوامی سیاسی مضامین کے علاوہ معاشی مضامین میں "زمینداری کی تاریخ اور اس کے مستقبل" اور یہاں کے "مہاجنی یا بنیکاری کی تاریخ، اور اس کے کاروباری نظام" پر مفید مضمون ہیں، سیاسیات عالم پر جو نئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا تعارف ہے، مختلف ملکوں کے موجودہ تعلیمی حالات ہیں، آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کی مرتب کردہ "واردھا ایجوکیشن کمیٹی کی رپورٹ" ہے، گویا یہ نمبر بین الاقوامی سیاسیات کا اطلس ہے، رسالہ جامعہ کے متعلق ہماری عرصہ سے یہ رائے تھی، جس کے اظہار کا اب موقع ملا، کہ وہ علم و ادب کو چھوڑ کر صرف تعلیم اور سیاسیات کو اپنا موضوع بنا لیتا، علم و ادب کے رسالے تو بہت سے ہیں، لیکن دنیا کے سیاسی حالات بتانے والا کوئی نہیں، یہ چیز جامعہ کے مذاق کے مطابق بھی ہے اور مفید بھی،

علیگڈھ میگزین تعطیلات نمبر، مرتبہ جناب معین الدین دردائی صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

علیگڈھ میگزین کا یہ خاص نمبر معین الدین صاحب دردائی نے محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے اسکے مضامین معیاری مفید اور پر از معلومات ہیں، لائق اڈیٹر کا لکھا ہوا مضمون "انقلاب اسپین" اسپین کے گذشتہ اور موجودہ حالات کی اجمالی تاریخ اور موجودہ انقلاب کے سمجھنے کے لئے کار آمد ہے، "بغاوت یونان اور سیاسیات یورپ" بھی اچھا مضمون ہے، "رجب علی بیگ سرور" کا مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے، پروفیسر عبد الباسط صاحب کا مضمون "ہندوستانی زبان اور معاشرت پر انگریزی اثرات" نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے، علی گڈھ کی فضا کے لئے ایسے مضامین کی بڑی ضرورت ہے، "ہم خدا کو کیوں نہ آزمائیں" افسانے کے رنگ میں خدا شناسی کا اچھا درس ہے، یہ نمبر علیگڈھ میگزین کی ترقی کا اچھا نمونہ ہے،

سالنامہ ہمایوں مرتبہ جناب میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ لارنس روڈ لاہور،

پنجاب کے رسالوں میں ایک ہمایوں ہی ایسا وضعدار رسالہ ہے، جو شروع سے ابتک ایک روش پر قائم ہے، خاص تقریبوں میں بھی اس کی متانت میں فرق نہیں آتا، چنانچہ اس کے خاص نمبروں میں بھی ظاہری تجمل نظر نہیں آتی جو سالناموں کا طغرائے امتیاز ہے، لیکن جو کچھ پیش کرتا ہے، وہ سب مفید سنجیدہ اور لائق قدر ہوتا ہے، اگرچہ اس کا سالنامہ دوسرے رسالوں کے سالناموں کے مقابلہ میں نہایت مختصر ہے، لیکن جو کچھ ہے، سب پڑھنے کے لائق ہے، فاضل اڈیٹر کے لکھے ہوئے نوٹس اور "اشتراکیت" کا مضمون خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے، پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کا مضمون "غالب اور بیدل" اچھا مضمون ہے، گو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے، افسانے بھی دلچسپ ہیں، غرض ہمایوں کا سالنامہ حشو و زوائد سے پاک ہے،

سالنامہ ادبی دنیا، مرتبہ جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۲ صفحے

کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ کمرشیل بلڈنگس مال روڈ لاہور،

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ قریب قریب اخبار کی تقطیع پر ایک ضخیم کتاب کی شکل میں نکلا ہے، ادارہ نے ہر مضمون پر رائے ظاہر کر کے خود ہی تنقید کا فرض انجام دے لیا ہے، بہرحال ظاہری شان و شکوہ بلکہ حجم میں یہ سالنامہ دوسرے تمام سالناموں سے بڑھ گیا ہے، لیکن ظاہر و باطن میں تناسب کم ہے، پھر بھی مضامین و مواد کے لحاظ سے اس میں خاصہ سامان موجود ہے، ادب و افسانہ کے مقابلہ میں سنجیدہ علمی مضامین بہتر ہیں، "بیگمات اودھ کے خطوط"، "فرنگی مبلغ دربار مغلیہ میں"، "گارڈنر خاندان کے شعراء" اور "خندہ طبی داس" اچھے اور مفید مضامین ہیں، افسانوں میں "جوانی کا خواب"، "عزت و ممتا"، "برابر کی چوٹ"، اور "شاعر کی موت" دلچسپ ہیں، نظموں کا حصہ بھی خاصہ ہے،

سالنامہ ساقی، مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ کھاری باولی دہلی،

ساقی کا سالنامہ ادب اور افسانوں کا اچھا مجموعہ ہے، افسانوں کے انتخاب سے حسن مذاق نمایاں ہے، ساقی کے خاص نمبروں کی یہ خصوصیت لائق ذکر ہے کہ ان میں عموماً فاضل مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے دوسری زبانوں کے کسی نہ کسی "ادبی شاہکار" کا ترجمہ ہوتا ہے، چنانچہ اس نمبر میں بھی شکسپیر کے مشہور ڈرامے "میکبتھ" کا ترجمہ ہے، اس طرح ابتک دوسری زبانوں کے متعدد بہترین افسانے اور ڈرامے ہندوستانی میں منتقل ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ اور بہت سے دلچسپ افسانے و ڈرامے، اور بعض ادبی مضامین ہیں، ان میں "بھوجانی"، "سعید"، "تعمیر جنون"، اور "فسادی" بہتر ہیں، خصوصاً فسادی بہت خوب ہے، پروفیسر شادانی صاحب کا مضمون "دور حاضر اور اردو غزل گوئی" غالباً مزاحیہ رنگ میں ہے، اس لئے کہ اسے سنجیدگی پر محمول کرنا پروفیسر صاحب کیساتھ سوئے ظن ہوگا،

سالنامہ عالمگیر، مرتبہ جناب حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۳۵ صفحے کاغذ معمولی

کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نے حسب معمول اپنے ناظرین کی سالانہ ادبی ضیافت کے لئے اپنے سالنامہ میں مختلف رنگ کے دلچسپ افسانوں، مفید علمی اور ادبی مضامین کا ستھرا سامان مہیا کیا ہے، سنجیدہ علمی مضامین میں "ہندوستان کا اردو نثر" "افلاس" "افضل خان علامی" "کچھ اقبال نامہ جہانگیری سے" "اور انسانی پرواز کی تاریخ" مفید ہیں، افسانوں میں "پرائی اولاد" "کرکٹ پیچ" "لنگوڑے مردوئے" "ایک راز" "خانم نے انگریزی پڑھی" "بے گناہ کش" وغیرہ قریب قریب دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، علمی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے عالمگیر کا سالنامہ کامیاب نمبر ہے،

سالنامہ ادب لطیف مرتبہ جناب چودھری برکت علی صاحب بی اے و مرزا ادیب صاحب بی اے، تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ دفتر ادب لطیف، نولکھا بمبر ۹، لاہور،

اس سالنامے میں ادب لطیف کی تمام خصوصیات موجود ہیں، ۲۲۰ صفحے کا دلچسپ اور ستھرا سامان مطالعہ ہے، زیادہ تر افسانے ہیں، ان میں "پریم کا جادو" "صحرا نورد کے خطوط" "اور خاوند کی ضرورت" زیادہ بہتر ہیں، علمی مضامین میں دنیا کی اہم تحریکات مفید ہے، "التماس بے خودؔ" کے لا متناہی سلسلہ بحث میں اگرچہ مفید ادبی باتیں بھی علم میں آتی ہیں، لیکن اب اس قضیۂ نامرضیہ کو ختم کر دینا چاہئے،

پیام تعلیم سالگرہ نمبر مرتبہ جناب مولوی حسین حسان صاحب ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۵ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

بچوں کے مشہور و مقبول رسالہ پیام تعلیم نے حسب معمول جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر سالگرہ نمبر نکالا ہے، اس کے ناظرین اس کی اس خصوصیت سے ناواقف نہ ہوں گے، کہ وہ مضامین میں بچوں کے مذاق کے ساتھ ان کی علمی اور اخلاقی تعلیم کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے، چنانچہ اس نمبر میں خالص بچوں کے مذاق کے حکایات و لطائف کے ساتھ، علمی تاریخی، سیاسی مضامین، سائنس کے ایجادات و اختراعات، جدید تحقیقاتوں اور اکتشافات

اور مختلف قسم کے مسائل و معلومات کو نہایت آسان، سادہ اور بچوں سے خطاب کی زبان میں اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ وہ انہیں قصہ کہانی کے طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، خالص بچوں کی دلچسپی کے تفریحی مضامین، قصہ کہانیاں اور لطائف بھی ہیں، لیکن ان میں بھی بیشتر اخلاقی پہلو پیش نظر ہے، کچھ تصاویر اور کارٹون بھی ہیں، اس طرح یہ نمبر گویا ان کے سامان تفریح اور نصاب تعلیم دونوں کا کام دیتا ہے،

سالنامہ شاہکار مرتبہ حکیم عارف صاحب بلگرامی تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ر، پتہ دفتر شاہکار گورکھپور،

عام رسم کے مطابق گورکھپور کے ادبی رسالے شاہکار نے بھی غالباً پہلی مرتبہ اپنا سالنامہ نکالا ہے اور اس کے لئے مشہور شعراء اور اہل قلم کے اچھے مضامین و منظومات فراہم کئے ہیں، قاضی تلمذ حسین صاحب کا نیم تاریخی مضمون "نجد و حجاز" نہایت دلچسپ ہے، "جدید اردو نثر کے رجحانات" مفید مضمون ہے لیکن موضوع کی اہمیت اس سے زیادہ بسط و شرح کی طالب تھی، "باندی کا تمدن" اس سے زیادہ موثر افسانہ کی شکل میں الہلال کے دوسرے دور میں نکل چکا ہے، "باورچی کا انعام" گو مختصر ہے مگر سبق آموز ہے اور متعدد چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں،

تنویر کراچی نمبر، مرتبہ جناب عبد الحمید صاحب جلیسری ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۸ر، پتہ تنویر پریس لارنس روڈ کراچی؛

کراچی اگرچہ ہندوستان کا آخری کنارہ ہے، لیکن وہاں ہندوستانی زبان کا خاصہ مذاق ہے، اس کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک جماعت موجود ہے، گذشتہ دسمبر میں وہاں "سندھ پراونشل اردو کانفرنس" کا اجلاس منعقد ہوا تھا، یہاں سے ہندوستانی کے متعدد اخبارات اور رسالے نکلتے ہیں، ان میں ماہانہ رسالہ تنویر نے کراچی نمبر نکالا ہے، اس میں کراچی کی گذشتہ عمرانی و سیاسی تاریخ اور موجودہ تجارتی، صنعتی تعمیری اور علمی و ادبی ترقیوں اور یہاں کی اسلامی جماعتوں اور ان کے مذہبی، قومی علمی اور ادبی اداروں کے حالات، اور متعدد ممتاز لوگوں کے فوٹو ہیں، یہ نمبر کراچی کے متعلق عام معلومات کا اچھا مجموعہ ہے،

"م"

دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں ابتک شائع ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے، اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے، چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:-

۱- یہ بالکل جدید ترین لغت ہے، انگریزی زبان میں ابتک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں، وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں،

۲- اسکی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ انکے معنی بھی شامل ہیں جنکا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے، اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوتے ہیں،

۳- ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں، اور امتیاز کیلئے نمبر شمار دیدیا گیا ہے،

۴- ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، انکی توضیح مثالیں دیکر کی گئی ہے،

۵- اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لئے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے، اور اس غرض کے لئے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے، یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی،

۶- ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے، ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں، جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں،

۷- اس لغت کیلئے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا، جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے، طباعت کیلئے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں، جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے،

(ڈیمائی سائز صفحات ۱۵۱۳ + ۲۴) قیمت سولہ روپے، کلدار، علاوہ محصولڈاک،

ملنے کا پتہ:- دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

مطبوعات جدیدہ

نفحۃ العنبر من هدی الشیخ الانور (عربی) مرتبہ مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اچھی قیمت مرقوم نہیں پتہ مجلس علمی جامعہ ڈابھیل سورت،

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے علمی تبحر و وسعت نظر اور زہد و ورع کے لحاظ سے اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، وہ جملہ مذہبی علوم خصوصاً حدیث و رجال کا بحر زخار تھے، ان کی ساری زندگی اس فن شریف کی خدمت اور اشاعت میں بسر ہوئی، اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں تشنگان علم آپ کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے، آپ کے علمی کمالات اور مذہبی خدمات کا تقاضا تھا، کہ اہل علم کے استفادہ اور اسوۂ عمل کے لئے آپکی سیرت لکھی جاتی، خوشی کا مقام ہے، کہ آپکے تلمیذ رشید مولانا سید محمد یوسف صاحب استاذ معانی و ادب جامعہ ڈابھیل نے نفحۃ العنبر کے نام سے شیخ کے حالات لکھ کر اس اہم فرض کو ادا کیا، اس کتاب میں حضرت مولانا کے سوانح و شمائل مختصر اور ان کی علمی و مذہبی خدمات کسی قدر تفصیل کیساتھ ہیں، جس سے آپ کے علمی مرتبہ کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے، علمی کمالات کے سلسلہ میں تفسیر، حدیث اور فقہ میں وسعت نظر، ان کے مشکلات و پیچیدہ مسائل میں دقیقہ سنجی اور عالمانہ تحقیق، احادیث سے فقہی مسائل کے استنباط میں مجتہدانہ کمال، ائمہ اربعہ کے اختلافی مسائل میں طریقہ بحث و تحقیق اور اعتدال مسلک، طریقہ درس، علمی مباحث میں نکتہ سنجی اور دقت نظر، تالیفات اور ان کی خصوصیات، غیر مذہبی علوم و ادب و فلسفہ وغیرہ میں آپ کا پایہ اور اس پر عالمانہ و محققانہ نقد و نظر، غرض جملہ علمی کمالات پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے، ان مباحث میں قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے مذہبی اور غیر مذہبی علوم میں حضرت شیخ کی بہت سی تحقیقات، رائیں اور علمی نوادر و نکات بھی معرض تحریر میں آگئے ہیں، جو اہل علم کے لئے مفید اور لائق غور

ہیں، ان علمی کمالات کیساتھ دوسرے علمی اور مذہبی خدمات کا بھی ذکر ہے، آخر میں حضرت مولینا کے متعلق مشاہیر علمار کی رائیں ہیں، یہ کتاب نہ صرف سوانح کی حیثیت سے بلکہ علمی حیثیت سے بھی مفید چیز ہے، کتاب کی زبان عربی ہے، اور خوشی کا مقام یہ ہے، کہ وہ فقیہانہ نہیں، بلکہ ادیبانہ ہے، کہیں کہیں پر زبان کے بعض مسامحات نظر آتے ہیں، "م"

سرکار کا دربار، مولفہ جناب محمد ایس احمد صاحب مجیبی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

معارف کے صفحات پر ایس احمد صاحب مجیبی کی مرتبہ سیرت "سرکار کا دربار" کا اس سے پہلے تعارف ہو چکا ہے، اسکو اللہ تعالیٰ نے اتنا حسن قبول بخشا، کہ چند سال کے عرصہ میں اس کے آٹھ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تازہ آٹھویں اڈیشن میں مجیبی صاحب نے بہت سی مفید ترمیمیں اور اصلاحیں کی ہیں، روایات کی صحت میں از سر نو سیرت کی مستند کتابوں سے چھان بین کی ہے، زائد باتیں نکال کر بہت سی نئی اور مفید باتیں بڑھائی ہیں، الفاظ اور طرز ادا میں مناسب تبدیلی کی ہے، ان اصلاحوں سے کتاب کی معنوی خوبی اور بڑھ گئی ہے، یہ سیرت پاک نہ صرف بچوں کے لئے بلکہ بڑی عمر کے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی مفید ہے، اس میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کے جملہ ضروری حالات مختصراً آسان زبان میں جمع کر دیئے گئے ہیں، نوجوان مؤلف اس حیثیت سے مبارکباد کے قابل ہے، کہ اس نے اپنی محنت کا ثمرہ آغاز سے اب تک مقدس دور کی خدمت قرار دیا ہے، اور یہ وہ جوہر ہے جو ہمارے نوجوان ادیبوں میں عنقا ہے، خدا کرے کہ وہ اپنی زندگی کے پورے ایام ان ہی مفید خدمات کے سلسلہ میں بسر کر دیں، "س"

جنت کی کنجی، مولفہ مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ دینی بک ڈپو کوچہ ناہر خان دہلی،

جنت کی کنجی مولینا احمد سعید صاحب کی پرانی تالیف ہے، اس کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا شائع ہوا تھا، مزید اضافہ کے ساتھ یہ دوسرا اڈیشن نکلا ہے، پہلے اڈیشن میں ان حدیثوں کا ترجمہ تھا جن میں آنحضرت صلعم نے کسی عمل خیر کے صلہ میں لفظاً جنت کی تصریح کیساتھ جنت کی بشارت دی ہے، اس نئے اڈیشن میں ان حدیثوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جن میں عقائد، عبادات، معاملات اور عام اخلاق وغیرہ میں عمل خیر کی تلقین ہے جس پر عمل کا نتیجہ جنت ہے، اس طرح یہ کتاب اعمال خیر کی ترغیب کا درس بن گئی ہے، ترجمہ کہیں پوری حدیث کا ہے، کہیں صرف اس مقصود کے ٹکڑے کو لے لیا گیا ہے، کہیں لفظی ہے کہیں صرف مفہوم لے لیا گیا ہے، بعض مجمل حدیثوں کی تشریح کر دی گئی ہے، حدیثوں کے ساتھ ماخذ کا حوالہ بھی دیدیا گیا ہے، عام مسلمانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا،

سبیل الرشاد، مولفہ جناب ڈاکٹر عبد المجید صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸ر علاوہ محصول، پتہ دار السلام نپیر اسٹریٹ کراچی،

بعض صاحب ذوق اور صاحب قلم حجاج، حرمین شریفین سے عام مسلمانوں کے لئے "سفر نامہ" کا تحفہ لاتے ہیں، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی قبیل کا قلمی تحفہ ہے، اس میں حاجی عبد المجید صاحب نے اپنے سفر حج کی روداد لکھی ہے، ذاتی حالات کے علاوہ اس میں حج کرنے والوں کے لئے ضروری ہدایات، مفید معلومات مناسک، حج کی روداد، حرمین کے مآثر و مقامات مقدسہ حکومت کے انتظامی حالات مختلف قوموں کے حجاج کی خصوصیات، سفر حج کے اخراجات اور بہت سی مفید معلومات ہیں، حج ایسے دربار کی حاضری ہے کہ قدرۃً اس سفر میں ہر مسلمان کا دل ذوق شوق اور کیف و وجد کا سرچشمہ بن جاتا ہے، اور زبان و قلم سے بھی بے ساختہ وہی کیفیتیں ٹپکنے لگتی ہیں، یہ کیفیتیں جا بجا اس سفر نامہ میں بھی ہیں، عام حج کرنے والوں کے لئے اس قسم کے سفر نامے رہنما کا کام دے سکتے ہیں،

انور، مصنفہ منشی فیاض علی صاحب ایڈوکیٹ فیض آباد، تقطیع اوسط ضخامت ۵۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عار پتہ انڈین پریس الہ آباد،

منشی فیاض علی صاحب موجودہ دور کے اچھے ناول نگاروں میں ہیں، ان کا پہلا ناول شمیم کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے، دوسرا تازہ ناول انور اسی کا نقش ثانی ہے، دونوں میں نقش اول اور نقش ثانی کا فرق نمایاں ہے،

پلاٹ کافی پیچیدہ ہے، لائق مصنف نے اس کو کامیابی سے نباہا ہے، روداد کے لحاظ سے اس میں حسن و عشق کی وارداتوں،
محبت و الفت کی داستانوں، رزم و بزم کے مناظر، ایثار و قربانی، جانبازی و فداکاری، بلندیٔ نظر و حوصلہ مندی، عفت
و پاکدامنی، خبث و بدنفسی، مکر و فریب، سنگدلی و خودغرضی، انسانی فطرت کے تمام مختلف پست و بلند پہلوؤں کی
کامیاب مصوری کی گئی ہے، اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے جذبات و میلانات، اخلاق و معاشرت میں ان کے خیالات
کو دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے، زبان انشاء پردازانہ اور انداز بیان دلآویز ہے، دلچسپ اور پسندیدہ اشعار
کی آمیزش نے لطفِ بیان کو اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو لوگ اودھ کے نوجوانوں کی باہمی بے تکلفی، ان کی شوخی،
ظرافت اور مذاقِ طبیعت سے ناآشنا ہیں، ان کو غالباً جابجا شوخیٔ گفتار گراں گذریگی، واقعات میں کہیں کہیں
"افسانویت" زیادہ نمایاں ہوگئی ہے، حالانکہ ناول کے واقعات کو روزمرہ کے مشاہدات و تجربات اور فطرت
سے اس قدر قریب ہونا چاہئے، کہ "افسانہ" بھی "حقیقت" معلوم ہو، بیان میں غیر معتدل طوالت ہے، لیکن کتاب
کی مجموعی خوبیوں کے مقابلہ میں یہ نقائص بہت خفیف ہیں، امید ہے کہ "انور" کو تبسم سے زیادہ حسنِ قبول
حاصل ہوگا،

چند ہم عصر مصنفہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو، ضخامت ۱۵۱ صفحے، کاغذ کتابت و
طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، غالباً روپیہ بیس آنہ تک ہوگی، پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن
مولوی عبدالحق صاحب نے متعدد مشاہیر کی وفات پر ان کے حالات لکھے تھے، یا تقریروں میں بیان کئے
تھے، بعضوں کی تصانیف پر مقدمہ کے سلسلہ میں ضمناً مصنف کے حالات قلمبند کئے تھے، یہ حالات ان کے
ایک ہونہار اور جوانمرگ شاگرد، شیخ چاند مرحوم نے کتابی شکل میں مرتب کئے تھے، جسے اب انجمن ترقی اردو نے شائع
کیا ہے، اس میں متعدد مشاہیر امیر مینائی، سید محمود، مولوی چراغ علی، مولوی عزیز مرزا، شمس العلماء سید علی بلگرامی،
خواجہ غلام الثقلین، مولوی وحیدالدین سلیم، نواب محسن الملک، شیخ غلام قادر گرامی، مولانا حالی، مولانا محمد علی اور بعض ایسے لوگوں کے
حالات ہیں، جو غالباً ذاتی تعلق اور شخصی واقفیت کی بنا پر لکھے گئے تھے، مثلاً پروفیسر مرزا حیرت (الٰہی)، حکیم امتیاز الدین

نورخان، ان میں سے بیشتر تو قریب قریب معاصر ہیں، لیکن بعض غیر معاصر بھی آگئے ہیں، جیسا کہ اوپر کے ناموں سے
ظاہر ہے، گذری ہوئی کہانی موجودہ حالات سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے، اس لئے یہ حالات لطف سے خالی
نہیں ہیں، ان حالات سے بہت سے پرانے واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، واقعات کے علاوہ مولف نے قلم
نے اشخاص کی سیرتوں کی اچھی مصوری کی ہے،

نصاب ضبط و انتظام و حفظانِ صحت مدرسہ — مترجمہ جناب سید محمد ابو یونس صاحب عظیم آبادی، تقطیع اوسط، ضخامت
۵۵۴ صفحے، کاغذ بہتر، خط ٹائپ، قیمت مجلد ؎، پتہ مترجم ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بنگلور

ہندوستانی میں اصول و نظامِ تعلیم پر اچھی کتابیں کم ہیں، اب کچھ دنوں سے ماہرین تعلیم نے ادھر توجہ کی
ہے، چنانچہ اس سے پہلے خواجہ غلام السیدین نے "اصولِ تعلیم" ایک ضخیم کتاب لکھی، مذکورۂ بالا کتاب ایک دوسرے مسلمان ماہرِ تعلیم
سلطان محی الدین صاحب ایم اے ڈپٹی ڈائرکٹر سی پی کے تعلیمی معلومات و تجربات کا خلاصہ ہے، اصل کتاب
انگریزی میں ہے، سید محمد ابو یونس صاحب ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ ہائی اسکول بنگلور نے عام فائدہ کے لئے اس کا
ہندوستانی میں ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے، اور موجودہ تعلیمی نظام کے متعلق جملہ معلومات اور
جدید مباحث پر محیط ہے، پہلے حصہ میں تعلیم کے بنیادی مقاصد اور نفسیاتی اصولوں کو پیش کیا گیا ہے، دوسرے
میں اخلاقی و مذہبی تعلیم، دونوں کے تعلق اور ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحثیں ہیں، تیسرے میں اخلاقی تربیت اور
مدرسہ کی اجتماعی زندگی کے تعلق کو دکھایا گیا ہے، چوتھے میں مدرسہ کے تعلیمی نظام کے تفصیلی معلومات ہیں، پانچویں
میں مدرسہ کے حفظانِ صحت کے اصولوں کی تفصیل ہے، یہ کتاب کا سرسری خاکہ ہے، ہر حصہ میں اس کے موضوع
کے تمام جزئیات پر تفصیلی بحثیں ہیں، اور جابجا مختلف ملکوں کے نظامِ تعلیم اور ماہرین تعلیم کے بیانات اور شواہد ہیں، ہر حصہ
کے آخر میں اس کے ماخذ دیدیئے گئے ہیں، فنی نقطۂ نظر سے تو اس کتاب کے متعلق صحیح رائے ماہرین تعلیم ہی دے سکتے ہیں
لیکن مباحث کی نوعیت اور کثرت کے لحاظ سے جامع اور نظامِ تعلیم کے قدیم و جدید نظریوں پر حاوی معلوم ہوتی ہے،
ترجمہ اچھا ہے،

فطرتِ انسانی مصنفہ جناب سید اسد اللہ صاحب بی اے تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن،

انسانی فطرت کی تشریح اور اس کے اصول کا انضباط علم النفس کا اہم اور دلچسپ موضوع ہے، اس کتاب میں انسانی جبلت کے تمام پہلوؤں اور عملی زندگی میں اس کے مظاہر پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب سات ابواب پر تقسیم ہے، (۱) کیا انسانی فطرت کے قوانین بنائے جاسکتے ہیں، (۲) حیات انسانی میں عادت کا مقام (۳) بنیادی خواہشات (۴) غیر تشفی یافتہ خواہشات (۵) میلانات جو انسانی کردار کو ڈھالتے ہیں، (۶) تہذیب فکر و عمل کو راستہ پیدا کرتی ہے (۷) کردار اور شخصیت کا ارتقا، ہر باب میں اس کے موضوع کے تمام پہلوؤں کی علمی اور مثالی تشریح کی گئی ہے، انسانی فطرت کی نیرنگیوں کا مطالعہ نہ صرف علمائے نفسیات کے لئے بلکہ عام لوگوں کیلئے بھی دلچسپی کی خالی نہیں ہے،

دعوتِ عمل، مؤلفہ جناب مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب نگرامی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت مرقوم نہیں، پتہ ناظم انجمن تبلیغ الاسلام نگرام ضلع لکھنؤ،

مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب عرصہ سے اپنی بساط کے مطابق دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دے رہے ہیں اس سلسلہ میں ان کے شریک کار مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب نے ایک پندرہ روزہ اخبار دعوت بھی جاری کیا ہے دعوتِ عمل بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے اس میں مسلمانوں کو ہندوؤں خصوصاً آریہ سماج کی علمی و عملی تبلیغی سرگرمیوں کو دکھا کر انھیں اس کے مقابلہ پر آمادہ کیا گیا ہے، مقصد نیک ہے لیکن یہی چیز ذرا سی بے احتیاطی سے ہم کو غلط راستہ پر لے چلنے کا باعث بھی ہو سکتی ہے،

شریر لڑکا مؤلفہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۳ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

بچوں کا پانچ ایکٹ کا مختصر ڈرامہ ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ شریر بچوں کی شرارت کی جو انکی ذہانت اور جرأت کا نتیجہ ہوتی ہے افہام و تفہیم سے اصلاح کر کے مفید اور کارآمد بنایا جا سکتا ہے یہ ڈرامہ بچوں کیلئے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی،

(م)

سیر الصحابہؓ

سیرۃ النبیؐ کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعلِ راہ [illegible] سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرامؓ ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان [illegible] کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث [illegible] کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور [illegible] ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو آج [illegible] سے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علحدہ علحدہ قیمتیں حسب ذیل [illegible] جنکا مجموعہ معہ [illegible] ہوتا ہے، لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف [illegible] میں یہ دس جلدیں [illegible] نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول، خلفاء راشدین،	[illegible]	جلد ششم، سیر الصحابہ ششم،	[illegible]
جلد دوم، مہاجرین اول،	[illegible]	جلد ہفتم، سیر الصحابہ ہفتم،	[illegible]
جلد سوم، مہاجرین دوم،	[illegible]	جلد ہشتم، سیر الصحابیات،	[illegible]
جلد چہارم، سیر الانصار اول،	[illegible]	جلد نہم، اسوۂ صحابہ اول،	[illegible]
جلد پنجم سیر الانصار دوم،	عا/	جلد دہم، اسوۂ صحابہ دوم،	[illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ